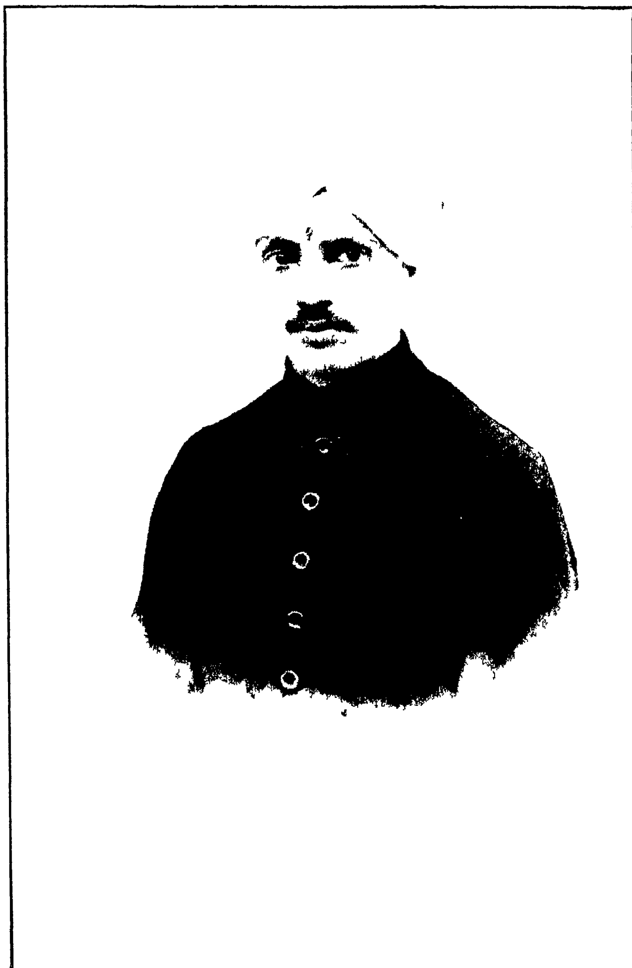
نہ پوچھو کون ہوں طالب بقول حضرتِ کیفی
بتادوں کسطرح تم کو کہ کیا ہوں میں کہاں ہوں میں



طالب کاشمیری - عمر ۲۷ سال

فہرست مضامین

نمبرشمار	مضامین	صفحہ

تمہید

نہیں ہونگے نہ ہوں ہم کارنامے عشق کے لیکن
رہینگے صفحۂ ہستی پہ قائم داستاں ہوکر

کرمفرماؤں کے متواتر ارشاد - دوستوں کے لگاتار تقاضے - اور احباب و اقارب کے بار بار اصرار نے آخر مجھے اس بات پر مجبور کیا - کہ کلامِ طالب کے اوراق پریشاں کو کتابی صورت میں ہدیہ ناظرین کروں ورنہ میں ابھی اس کام کی انجام دہی کے لیے تیار نہ تھا - اور یہی وجہ ہی کہ تقریباً دو سال سے آج تک اس اشاعت کو ملتوی رکھا میں اُن تمام اصحاب کا شکریہ ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتا -

اس ناچیز کلام کی حیثیت اور وقعت ادبی دنیا میں کیا ہی - اس کی نسبت اپنی طرف سے کچھ عرض کرنا بے محل اور بیجا معلوم ہوتا ہی اہلِ ذوق خود اس کا اندازہ فرما سکتے ہیں - اس اشاعت سے نہ دعویٰ شاعری مقصود ہی نہ اظہار شہرت ہاں اتنا ضرور ہی کہ کچھ عرصے سے میں بھی اس امر کا خواہاں تھا کہ جو کچھ میں نے تفریحِ طبع کے طور پر یا دوستوں کے اصرار سے کہا ہی یکجا ہو کر محفوظ رہے -

یہاں اس قدر کہہ دینا ضروری ہی کہ اگرچہ میں کوئی باضابطہ شا

نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ شعر و سخن کا دلدادہ ہوں۔ ذات الٰہی کے تصور کے علاوہ دنیا کی کوئی چیز میری نگاہوں میں شعر سے بڑھ کر وقعت نہیں رکھتی جو سرورِ قلب۔ لطفِ محویت اور حالتِ وجد مجھ پر اس سے طاری ہوتی ہے۔ اس کا بیان حدِ امکان سے باہر ہے۔ جو اُنس مجھے اس سے ہے جو کیفیت اور بیخودی مجھے اس سے حاصل ہوتی ہے وہ صورت حال ہے بیانِ قال نہیں۔ ادراک تصور سے اس کا ذہن میں اُتارنا آسان کام نہیں۔ رنگین بیانی الفاظ میں اس کی تصویر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ احساس اس کا صحیح معیار ہے۔ یہ سمجھیے کہ دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہو کر فنافی الشعر رہنا میرا پرم دھرم ہے۔ میرے نزدیک شاعری کا سب سے بڑا وصف یہی ہے اور ہونا چاہیے کہ اپنی تاثیر سے انسان کو قابو کرے اور اس قدر بیخود بنا دے کہ عالمِ ناسوت کے تعلقات سے آزاد کر کے گلزارِ لاہوت کی سیر کرا دے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے ۱۹۱۰ء سے میرے دل میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا۔ اس وقت تک میں فقط نثر میں کبھی کبھی مضامین لکھا کرتا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں دربار رتا جوشی کی یادگار میں لکھنؤ سے ایک رسالہ زیرِ اہتمام و ادارت منشی رام سہائے صاحب تمنا لکھنوی جاری ہوا منشی صاحب موصوف ملک الشعرا۔ منشی دوارکا پرشاد صاحب افق مرحوم کے قابل قدر بھائی اور با استعداد شاعر ہیں۔ خوش نصیبی سے مجھے ان سے اجرائے رسالہ کے چند روز بعد بذریعۂ خط و کتابت تعارف

حاصل ہوا۔ اور کئی سال تک استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ وقتاً فوقتاً ان کے طلب کرنے پر نظمیں بغرض اشاعت بھیجتا رہا یہ انہی کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ میری طبیعت کا میلان اس طرف زیادہ بڑھ گیا۔ اس کو بیاز مند کی شاعری کا پہلا دور سمجھنا چاہیے

چند سال کے بعد منشی صاحب میرے کلام کو من وعن شائع کرنے لگے اور اس میں کہیں حک و اصلاح کی ضرورت نہ سمجھنے لگے۔ انہی دنوں میں مولانا سید احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی مرحوم کا ایک اعلان مختلف اخباروں میں نظر سے گذرا جس میں انھوں نے اردو۔ بھاشا فارسی اور عربی کے تمام شعرار کو اصلاح لینے کی دعوت دی تھی میں نے بھی ایک نظم اصلاح کی غرض سے ان کے پاس بھیجدی۔ بجائے اس کے کہ نظم میں تسکین بخش اصلاح و ترمیم کرتے۔ بیجا اعتراضات اور کاٹ چھانٹ کرکے واپس کردی۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ مولانا مرحوم ایک قابل قدر علامہ اور با استعداد اُستاد تھے۔ جن کا دم مغتنمات سے تھا۔ ان کی وفات سے دنیائے علم و ادب میں ایک ناقابل تلافی نقصان واقع ہوا۔ ملک کے بہت سے نو عمر شعرا کو ان کے فیض صحبت سے بہت کچھ فائدہ پہنچا۔ لیکن نہ معلوم میری نظم پر دور از کار اعتراضات اور غیر موزوں نقائص وارد کرنے سے ان کا کیا مطلب تھا۔ اور صرف اسی پر بس نہ کی بلکہ خواہ مخواہ جگت گرو مجدد السنۂ مشرقیہ اور اورنٹیل ریفارمر قرار دیے جانے کا مطالبہ کرنے لگے۔ ملک کے

اہلِ قلم سے بھی یہ بات پوشیدہ نہیں کہ آخر عمر میں حضرت کی تعلی اور خودبینی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی جس نے اُن کے دماغ کو مختل و پریشان کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر علماء جتنا ان کی قابلیت کے مدّاح تھے اُتنا ہی ان کی اس اخلاقی کمزوری سے بیزار رہتے۔ بہرحال کچھ تو ان کے اشتعال اور کچھ اپنے تقاضائے سن سے باہمی تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی اور باقاعدہ بحث و مباحثہ اور تکرار کی نوبت پہنچی۔ جس کی روداد و تمام و کمال "اخبارِ عام" لاہور کے سنہ ۱۹۱۳ء اور سنہ ۱۹۱۴ء کی مختلف اشاعتوں میں بہت دنوں تک برابر شائع ہوتی رہی۔ اس سے اخباری دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا تھا۔ کیونکہ اس دلچسپ مباحثے میں علاوہ بمابین کے ملک کے کئی دیگر اہلِ قلم نے بھی حصہ لیا تھا۔ اگر اس سارے مجموعی کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو مشہور کتاب "معرکۂ چکبست و شرر" یعنی "مباحثۂ گلزارِ نسیم" سے کچھ کم نہ ہوگا۔ اس اثنا میں اور نیز اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک میں نے کسی اُستاد سے باضابطہ اصلاح نہ لی یہ وقت راقم کی شاعری کا دوسرا دور قرار دیا جا سکتا ہے۔

آج سے تقریباً ۹ سال پیشتر میں نے قبلہ و کعبہ جناب پنڈت برج موہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی سے اس امر کی درخواست کی کہ مجھے اپنی شاگردی میں قبول کریں۔ صاحب موصوف اِن دنوں نواب صاحب کنجپورہ کے پرائیویٹ سکریٹری اور دیوان تھے۔ اور باوجود عدیم الفرصت ہونے کے اس کرم و عنایت اور ہمدردی سے

جوان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ انھوں نے میری درخواست کو قبول فرمایا اور تب سے برابر ہر طرح نہایت شفقت اور دل سوزی سے تربیت پدرانہ فرماتے رہے۔ استاد نامدار اس ہیچمداں کی جانب سے ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ جناب ہندوستان کے مستند نہایت ذی استعداد اور مسلم الثبوت استاد و ماہر فن ادب مانے جاتے ہیں۔ جس دلی محبت اور سچی ہدایت سے خاکسار کی رہنمائی کی اس کا شکریہ جتنا بھی کیا جائے کم ہے۔ میری ناچیز طبع آزمائی کو انھیں کی برکت اور فیض صحبت کا اثر سمجھنا چاہیئے۔ ؎

جمال ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

یہ خاکسار کی شاعری کا تیسرا دور ہوگا۔

اس مجموعے میں اکثر ابتدائی نظمیں درج کی گئی ہیں اور جیسا کہ ناظرین آگے چلکر معلوم کریں گے۔ ایسی نظموں کی تعداد بہت کم ہے جو حال میں کہی گئی ہیں۔ اگر زمانے نے مہلت دی تو عنقریب بقیہ حصۂ کلام اور نثر کی ایک دو کتابیں جو ابھی نامکمل ہیں طبع کرانے کا ارادہ رکھتا ہوں

مختلف رسائل اور اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان کی عنایت کا بھی ممنون احسان ہوں کہ وہ اپنے جرائد میں برابر میرا کلام شائع کرتے رہے بلکہ بار بار طلب کرکے اس کو چھپوانا باعث مسرت سمجھتے رہے۔ ان میں سے "دربار لکھنؤ" "اخبار عام لاہور" "سناتن دھرم پرچارک"

امرت سر۔ "طریقت" لاہور "شیو شنبھو" لاہور" "دھورندھر" لکھنؤ۔ "مخزن" لاہور" "اتحاد" امرت سر۔ "الہلال" دہلی۔ "گلشن" لاہور۔ "رفیق التعلیم" لاہور "مستانہ جوگی" لاہور۔ "نظام" لاہور "معیار سخن" ناسک "رہبر" جموں "کشمیری میگزین" لاہور "بہار کشمیر" لاہور "صبح کشمیر" لاہور وغیرہ خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

اس مجموعے کو مطبع میں بھیجنے سے پہلے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ملک کے ایک دو نامور اور مستند اُستادوں کی رائیں اس کے متعلق لکھوا دوں جو اہلِ زبان اور نکاتِ فن سے بھی واقف ہوں۔ اہلِ دہلی میں سے اُستاد نادار سے بڑھ کر مجھے اور کوئی بہتر نقادِ سخن اس کام کے لیے نظر نہ آیا۔ چنانچہ دیباچہ لکھنے کی تکلیف انھیں کو گوارا کرنا پڑی۔ دیگر اُستاد جو ایسے امور میں کافی دسترس اور مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ اُن میں جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے۔ صدر مہتمم تعلیمات۔ سکرٹری انجمن ترقی اردو و سابق پرنسپل مدرسہ آصفیہ اورنگ آباد دکن۔ مشہور و معروف ہیں۔ انھوں نے بھی ایک مختصر گرامی نامے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے جو کلام کے اختتام پر شاملِ کتاب کیا جاتا ہے۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں کوئی کہنہ مشق اور باقاعدہ شاعر نہیں۔ جو کچھ کہا ہے محض تفننِ طبع اور سرورِ قلب کے اقتضا سے کہا ہے۔ امید ہے ناظرین بھی اسی نقطۂ نگاہ سے اِن

اوراق پریشاں کا مطالعہ فرمائیں گے۔

بُرا ہوں یا بھلا ملکِ سخن میں اس سے کیا مطلب
برنگِ نقشِ پا پھر بھی نشانِ رفتگاں ہوں میں

فقط

سری نگر
۱۶-اپریل ۱۹۲۵ء

خادم الشعراء
طالب کاشمیری



دیباچہ

از جناب پنڈت برج موہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی
اسسٹنٹ فارن سکرٹری ریاست جموں کشمیر

اردو بھی اہلِ ہند کی معشرت کے اور صیغوں کے ساتھ معرض تغیر و اصلاح میں ہے۔ یہ کس نتیجہ پر پہنچینگے۔ ان کا کیا حشر ہوگا۔ آیا ہم بہتری کی طرف جارہے ہیں۔ یا ابتری کی جانب۔ یہ ایسے سوال ہیں جن کا جواب انسانی پیش بینی اور مادی فراست سے بالاتر ہے۔ ہمارا روئے سخن اس وقت اردو زبان یا اردو شاعری کی طرف ہے۔ کیا بہ اعتبار ایک بھاشا کے اور کیا بہ اعتبار لٹریچر کے اردو کی توسیع روز افزوں ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی لغات دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات کا تنوع۔ تخیل کی بلند پروازی۔ حقیقت نگاری۔ فسانہ پردازی۔ مظاہر و احساس طرازی کے اسلوب کی طرز اور انشا کے اصول میں بھی تغیر عظیم واقع ہوا ہے اور ہو رہا ہے جن کا ذکر اس مقام پر ضرور نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ پُرانے نمونے اب محض ادبیات قدیمہ کی الماری کی زینت بن گئے۔ نصیر کی سنگینی۔ ذوق کی فصیح بیانی اور معنی آفرینی۔ مومن کی نازک خیالی۔ ناسخ کی شوکت بیانی۔ حسن کی سلیس نگاری اور نسیم کی مرصع کاری آج کل کے شعراء کے سر مشق نہیں۔ اساتذۂ سلف میں سے دو کے کلام کو اس وقت پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اِن میں سے ایک مرزا غالب ہیں اور دوسرے شاہ نصیر۔ اس بیان کا تعلق غزل کے سوا اور اصناف شعر سے ہے۔ پرانی چال کی غزل پر کم و بیش تمام ملک میں داغ کا رنگ حاوی و مسلط ہے۔ متین موضوع پر جو غزلیں لکھی جاتی ہیں وہ زیادہ تر غالب کو آگے رکھ کر لکھی جاتی ہیں۔ اگرچہ قسم اول میں نسیم دہلوی اور شیفتہ کا پرتو بھی جھلکتا ہے۔ غزل کے علاوہ اور کلام منظوم پر نظر ڈالی جائے تو زیادہ تر غالب کے پیرو ملینگے۔ اگرچہ غالب کے ہاں صرف غزلیں اور چند قصائد ہی ہیں۔ شاہ نظیر کے ہاں دال بیجی کا خوانچہ ہر وقت تیار ملتا ہے جس کی گرما گرم اور چٹ پٹی چیز اس کے آگے ہر کوئی اپنی جھولی پسار دیتا ہے۔ اگرچہ مومن کا ترکیب بند مرثیہ جو نظیری کے ہم مضمون ترکیب بند کو دیکھکر لکھا گیا تھا۔ اور نظیر کے متعدد ترکیب بند برابر پڑھے جاتے تھے۔ لیکن ترکیب بند کو اردو میں خواجہ حالی نے پھر تازہ کیا۔ جس طرح میر انیس اور مرزا دبیر نے مسدس کو قصیدے کے برابر کر دیا۔ اسی طرح خواجہ حالی نے ترکیب بند کو اس کے برابر لا بٹھایا۔ لیکن اب ترکیب بند میں حالی کا اسلوب رنگ طرازی

نہیں کرتا۔ یہ تذکرہ یہاں اس لیے آیا کہ طالب کا کلام ان اساتذہ کے کلام سے پرتو پذیر اور بہرہ اندوز ہوا ہے۔

جس شخص کے ساتھ ادبی تعلق ہو۔ اس کے کلام کا تبصرہ بہت سی مشکلات کا مولد ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ پرانی وضع کی تقریظ بن جاتا ہے۔ اور کبھی یہ کہ پوری داد سے محروم رہتا ہے جس کا موجب از بس احتیاط ہوتی ہے۔ با اینہمہ میرے خیال میں متعلقاتِ ادبی اس کا حق فائق رکھتے ہیں کہ ان کے کلام پر نظر ڈالی جائے۔ پنڈت نندلال کول طالب انگریزی۔ فارسی۔ اور اردو میں درجۂ فضیلت رکھتے ہیں۔ ان کی فضیلت سندی ہے۔ کیونکہ وہ۔ ایم۔ اے۔ ایم او۔ ایل منشی فاضل اور ادیب فاضل[له] کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔ لواحقات کو مدنظر رکھا جائے تو آپ اُنھیں ملا طاہر غنی مرحوم کا ہم وطن پائینگے اہلِ خطہ کی تاریخی ذہانت۔ اور فطانت کا ان کو پورا موروثی حصہ قدرت سے ملا ہے۔ ستھرا چلن۔ اور سلامت روی۔ انکسار۔ عالی ہمتی اور سادہ مزاجی ان کے شعار کے جزوِ اعظم ہیں۔ مزاج نخوت سے بعرا اگر استقامت سے مجلا ہے۔ حالانکہ نوجوان ہیں۔ لیکن طبیعت جوش و خروش سے بیگانہ ہے۔ ہمدردی اور جوانمردی ان کے آب و گل میں ہی بہ اہلیت۔ یہ سلیم المزاجی اور نیک اخلاقی ان کے اکثر ہم عمروں میں پائی نہیں جاتی۔

[له] اردو ادب کا اعلیٰ ترین امتحان جو پنجاب یونیورسٹی کے ماتحت ہوتا ہے (کیفی)

اگر بعض محاسن اس مرقع سے خارج ہیں تو وہ ان کے کلام سے بھی خارج ہیں۔ یا کہیے اس سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے۔ چنانچہ ان کی نظموں میں چہل پہل۔ چھیڑ چھاڑ۔ دھوم۔ دھام۔ ولولہ انگیزی۔ تعلی اور مبالغہ اور بدیعات اور لفظی مراعات (فرمایئے تو سنسنی خیزی بھی کہہ دوں) کم ملینگے جس طرح طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی ہے اسی طرح کلام میں بھی جامعیت موجود ہے۔ ایک مابہ الامتیاز یہ ہے کہ طبیعت چونکہ سلامت روی اور متانت کا جامہ پہنے ہے۔ کلام میں قاعدے کی پابندی بدرجۂ اتم مدنظر رہتی ہے اور یہ سب سے بڑا وصف ہے۔ طالب کے کلام سے نظری سبق اس امر کا ملنا چاہیئے کہ اصول اور قاعدے کی پابندی ملحوظ رکھتے ہوئے ہر صنفِ شعر میں اور ہر موضوع پر نظم کہہ سکتے ہیں۔ انوکھی بندشوں غرابت ثقیل لغات پیچیدہ اسلوب اور ژولیدہ بیانی سے ان کا کلام پاک ہے اس میں ایک نقص پرگوئی ہے۔ بعض نظمیں اور ترکیب بندوں کے بعض بند بے تحاشا لمبے ہو جاتے ہیں۔ اس سے کلام کی چستی جاتی رہتی اور تکرار کا نقص عائد ہو جاتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ نقص زیادہ مشق اور پختگیٔ خیال سے خود رفع ہو جائے گا۔

ناظرین کو تعجب ہوگا کہ ایک شخص وادیٔ کشمیر میں پیدا ہو کر اور وہیں رہ کر کیونکر ایسی ستھری اُردو لکھ سکتا ہے۔ یہ شخصیت اور یہ کلام بلند آواز سے اردو کی آیندہ حالت کی پیشینگوئی کرتے ہیں۔ یعنی کہ اُردو اب وہ زبان نہیں رہی جس کے چلن کو مقامی ٹکسال کی احتیاج ہو۔ جب ایک زبان اپنے

مولد و منشا سے نکل کر دور دراز کیا دور افتادہ مقامات میں جا کر سرسبز اور بار آور ہو سکے تو اس کی درازیٔ عمر اور تشخص ذاتی کی نسبت کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ جمنا اور گومتی کے لیے فخر کا مقام ہے کہ ان کی موجیں دنستا کے سر پر اٹھکھیلیاں کر رہی ہیں۔ ان کی گنگا جمنی رنگ آمیزیاں ولر اور ڈل کے شفاف آئینوں پر عکس افشاں ہیں۔ دھرتیوں کی دلاویز ہوائیں نسیم صبح کے جھونکوں سے پینگ بڑھا رہی ہیں۔ اور جھرنے کی بہار نشاط باغ اور شالامار کی سرچون آبشاروں سے سُر ملا رہی ہیں۔ طالب چاہے ناراض کیوں نہ ہوں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کا اردو میں ایسا اچھا شعر کہنا اتنا تحسین کے قابل نہیں جتنی آفریں کے قابل اُردو کی دلاویز قابلیت۔ جدباتی استعداد اور عالمگیر ذاتی مناسبت ہو کہ دہلی سے چل کر ہری پربت کے دامن پر اپنی دلاویزی کا رنگ جما دیا یہ آثار اردو کے لیے نہایت اطمینان بخش ہیں۔

طالب کے کلام میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر طرز میں اپنا رنگ جما جاتے ہیں۔ اپنے وقت پر وہ یقیناً صاحب طرز مانے جائینگے۔ احساسات قلبی کی تصویر کھینچنے میں ان کو کمال کا درجہ حاصل ہے۔ یہی حال حقائق نگاری کا ہے۔ مناظر قدرت کا جیسا سچا اور دلکش نقشہ کھینچتے ہیں تعریف کے قابل ہے۔ حب قومی کی ٹھیس بھی ان کے دل کو لگ چکی ہے۔ لیکن سلیم المزاجی حد اعتدال سے بڑھنے نہیں دیتی۔ مجاز میں جو کلام ہے اور وہ تھوڑا سے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو جسے ذاتی واقفیت نہیں۔ اس کے

زلفِ مسلسل سے زیادہ خم بہ خم اور بھول بھلیاں جیسے رستوں سے نا بلد ہیں - پھر بھی اس حصّہ کلام میں ایک سہانا بھولا پن اور سادہ دلآویزی پائی جاتی ہے -

زبان کی درستی اور محاورے کی صحت اس درجہ کی ہے کہ ایک اہل زبان کے کلام میں اور طالب کے کلام میں فرق کرنا مشکل ہے - کسبی محاسن میں ضرور ترقی کی گنجائش ہے جو امید ہے کہ اپنے وقت پر ہو جائے گی -

مجھے امید ہے کہ ہندوستان میں یہ کلام نہایت دلچسپی سے پڑھا جائیگا اور مقبول ہوگا -

جموں
۱۴ر فروری ۱۹۲۵ء

برجموہن دتاتریہ - کیفی

ادم

غزلیات

۲۷۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء کی شام کو نیاز مند کے استاد نامدار اپنے مکان پر موجود غزل گوئی کی نسبت اظہار خیالات فرما رہے تھے۔ دورانِ تقریر میں نیاز مند نے موقع پا کر نمونے کے طور پر چند غزلوں کے چیدہ اشعار سنانے کی درخواست کی۔ منجملہ دیگر اشعار کے جناب نے اپنی ایک غزل بھی سنائی جو مجھے نہایت پسند آئی۔ خصوصاً مطلع کا شعر تو نہایت ہی اچھا فرماتے ہیں ؎

ہم نے اس عالمِ فانی کو تماشا جانا
ایک نیرنگیٔ آشوبِ تمنّا جانا

گھر آکر اسی زمین میں ایک غزل لکھی، بلکہ انھیں کے مطلع کے قافیے بھی اپنی غزل کے مطلع میں باندھ دیے۔ غزل ان کی خدمت میں پیش کی اور تحسین و آفریں کا انعام وصول کیا۔ یہ وہی غزل ہے۔

ہم نے دنیا کو دو رنگی کا تماشا جانا
ایک اندازِ مدوجزرِ تمنا جانا

قائلِ جنت و دوزخ نہ ہو کوئی تو نہ ہو
فکرِ عقبیٰ دلِ دانا کا تقاضا جانا

کیا کہیں تم سے کہ کیا سمجھے ہیں ہم رازِ حیات
آنے جانے کا اسے ایک بہانا جانا

کس کو معلوم ہے ہم کس لیے ہیں صرفِ فغاں
یا عبث نالہ مگر آنکھ کا دھوکا جانا

آج کل جوش پہ ہے داغِ جنوں زخمِ جگر
کسی گلرو کی نظر کا اسے چرکا جانا

وا ہوئی خواب میں بھی چشمِ بصیرت جو کبھی
ہم نے دنیا کو دو رنگی کا تماشا جانا

حُسن کا دھوکا ہے یا عشق کی لذت لطافت
کیا بتائیں تمھیں ہم دل کا یہ آنا جانا

۱۱ نومبر ۱۹۱۳ء۔ غیر مطبوعہ

رنگ کیا یا رب پریشاں ہے مری گفتار کا
ہے سخن میرا کہ اک خاکہ ہے زلفِ یار کا

اس لبِ جاں بخش سے چشم ہے بیمارِ عشق
کیا کیا ہے کام اُس نے مردمِ بیمار کا

کیا بتاؤں اُس کی کس کس بات کا شیدا ہے دل
بانکپن کا ناز کا۔ گفتار کا رفتار کا

جیتے ہیں اے دوست ہم دنیا میں مرنے کے لیے
ہے مگر ہر ایک پیاسا شربتِ دیدار کا

لازمی مرنا ہے سب کو اور برحق موت ہے
وعدہ کیا اس قمارستاں میں جیت اور ہار کا

ہو گیا معلوم نامعلوم ہے کارِ جہاں
دھوکے کی ٹٹی ہے جلوہ نور کا یا نار کا

ہے مآلِ کارِ دنیا ایک دن طالب وصال
کیا بھروسہ ہو سکے اس بے وفا دلدار کا

۲۷ دسمبر ۱۹۱۴ء۔ غیر مطبوعہ

زباں پر حرفِ دردِ دل کا آنا ہو نہیں سکتا
ادا اس ساز سے ایسا ترانا ہو نہیں سکتا

اسیرِ بندِ الفت کی بُری حالت نہ کیونکر ہو
کہ بہتر اس سے مرنے کا بہانا ہو نہیں سکتا

معذب گھٹتے جاتے ہیں مہذب بڑھتے جاتے ہیں
موافق دوستو ہم سے زمانا ہو نہیں سکتا

خیالِ بوسہ بے جا ہے دل کیوں تڑپتا ہے
دہن موہوم ہے اس کا نشانا ہو نہیں سکتا

تمہارے وصل کے بھوکے ہزاروں حشر میں ہوں گے
اُدھار اس وعدۂ فردا پہ کھانا ہو نہیں سکتا

زمین و چرخ بدلیں ہو نظامِ دہر متغیر
مگر دِل سے ترے عاشق کا جانا ہو نہیں سکتا

بجز تیرے نہ چاہے اُس کو کوئی کب یہ ممکن ہے
مقفل یہ تو طالبؔ کا رخانا ہو نہیں سکتا

۱۸- اگست غیر مطبوعہ

عاشق نے دل دیا تو یہ کس کا قصور تھا
پی کر شرابِ حسن نشے میں وہ چور تھا

مجھ کو تو نازِ عجز تھا قاتل کے سامنے
اس کو متاعِ حسن پہ فخر و غرور تھا

اعمال بھی سیہ ہوئے جب عمر بڑھ گئی
پیری میں بھی شباب نہ کچھ ہم سے دور تھا

شعر و سخن کا مشغلہ ان کو نہ تھا پسند
لیکن وہ میرے واسطے جامِ سرور تھا

تھا شوقِ وصل جن کو بتِ خود پسند کا
ان کا شریک میں ہی فقط بے شعور تھا

آہٹ تھی تیرے پاؤں کی کافی مرے لیے
محشر اُٹھانے کو یہ عبث شورِ صور تھا

جتنا میں اُس کی یاد میں روتا رہا مدام
اتنا ہی دور مجھ سے وہ آنکھوں کا نور تھا

اپنی بغل میں تھا جسے ڈھونڈھا جہان میں
دیدارِ یار کے لیے دِل کوہِ طور تھا

طالبؔ یہ غفلت اپنی تھی کب یار دور تھا
دل بر میں گو نہ تھا مرے دلبر ضرور تھا

۱۳- جنوری ۱۹۱۵ء مطبوعہ دربار لکھنؤ

ہو گئے جب ہم اُسی کے وہ ہمارا ہو گیا
رازِ یکرنگیِ اُلفت آشکارا ہو گیا

ناخدا کو ہم جو بھولے ناؤ ہی منجدھار میں
کالے کاسوں دور دریا کا کنارا ہو گیا

ہم ہوئے یا آپ اس میں لطفِ یکتائی نہیں
پردہ جب اُٹھا تو پردہ فاش سارا ہو گیا

ہوتے ہیں اونے سے اعلیٰ اہلِ جوہر بعدِ مرگ — دیکھ لو اکسیر خالص مر کے پارا ہو گیا ۱؎
ایک عاشق کا سخن دل پہ ہے پتھر کی لکیر — اپنے حق میں دل بتوں کا سنگِ خارا ہو گیا

۱۹ مارچ ۱۹۱۹ء ۔ غیر مطبوعہ

اب داغِ آرزو بھی دکھاتا نہیں رہا — دل کو سنبھالنے کا بہانا نہیں رہا
یارائے ضبط اب نہیں اے ہمنشیں مجھے — اس بے بسی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا
ممنونِ پنبہ گوشیِ اہلِ جہاں ہوں میں — اب حالِ دل کسی کو سنانا نہیں رہا
ظلم و ستم جو کیجیے تو اعتدال سے — یہ اس لیے کہ اب وہ زمانا نہیں رہا
ناآشنا ہیں لذتِ گفتار سے یہ لب — کمبخت روٹھے دل کو منانا نہیں رہا
میرا دل شکستہ ہے کب آرزو طلب — اب منتوں سے تم کو بلانا نہیں رہا
ہے پیٹ پالنا تو نکالو کوئی مشین — اب شعر شاعری کا زمانہ نہیں رہا
سرگرمِ دشت گردیِ ملکِ عدم ہوں میں — جائے بقا میں تشکر ہے آنا نہیں رہا

ملکِ عدم کو طالبِ ناشاد چل دیا
جس وقت اس جہاں میں ٹھکانا نہیں رہا

۲۰ مارچ ۱۹۱۳ء ۔ مطبوعہ "رہبر" جموں و "صبحِ کشمیر" لاہور

۲؎ ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا — دنیا میں بے بدل ہے یہ گلستاں ہمارا

۱؎ استاد کا شعر ہے ؎

من کو مارو پھر خدا جانے کہ کیسی کیمیا — دیکھ لو اکسیر خالص مر کے پارا ہو گیا

۲؎ ڈاکٹر اقبال کے مشہور ترانے کا پہلا مصرعہ

بھارت ہماری ماتا سنتان ہم سب اسکی — آغوش اس کا مسکن ہی یکساں ہمارا

اللہ رے ضعف و غفلت اللہ رے سلب طاقت — بوڑھوں سے ناتواں ہی ہر نوجواں ہمارا

بغض و حسد نے مارا آباد گھر اجاڑا — برباد ہو چکا ہی سب خانماں ہمارا

یا لاکھ کا گھر اس نے ہی خاک میں ملایا — یہ آسماں رہا ہی ایذا رساں ہمارا

اے کاش دل میں ہو پھر الفت وطن کی پیدا — دکھلائے رنگ اپنا سوزِ نہاں ہمارا

کرتے ہیں ہجو پیارے اپنے پرائی سلطے — پہلے تو کل زمانہ تھا مدح خواں ہمارا

۹ ستمبر ۱۹۱۳ء - غیر مطبوعہ

حوزو پہ آیا عشق کی برباد ہو گیا — مطعون گو جہان میں فرہاد ہو گیا

منصور نے کہا دمِ آخر یہ دار پر — مجرم بنا جو عشق کا منقاد ہو گیا

میں تو قریبِ مرگ تھا خواہانِ مرگ تھا — بدنام میرے قتل میں جلاد ہو گیا

آیا نہ میرے ملنے کو اب بھی وہ خوب ہیں — دعوے یہ میرا خارجِ میعاد ہو گیا

تعلیم پا کے عشق کے کالج میں چند روز
طالب ہمارا مستندِ استاد ہو گیا

۱۶ جون ۱۹۱۲ء مطبوعہ طریقت لاہور

اب کوئی رازِ محبت کا یہاں محرم ہوا — اور جو واقف ہوا خاموش اور بیدم ہوا

بادِ حق سے راز سربستہ جو تھے سب کھل گئے — دھیان ابشر کا ہمارے حق میں جامِ جم ہوا

ہم نے کر دیا پابند خودی کو اور بھی — کامِ جاں میں آبِ حیواں تلخ تر از سم ہوا

عیش اور عشرت پسندی ہو گئی اب مجھ سے دور — مایۂ صد شادمانی میرے دل میں غم ہوا

چونکہ آخر مائلِ پستی ہی اس دنیا کا اوج — عاجزی سے مثلِ فوارہ مرا سر خم ہوا

تیغِ ہجرِ یار سے گھائل تھا یہ سینہ میرا
پر خیالِ وصل زخموں کے لیے مرہم ہوا

تیری صحبت سے ہوئے تھے سینکڑوں راحت نصیب
جب تو چھوٹا قیامت کا بپا عالم ہوا

دن کو میں جلتا رہا مثلِ تنورِ آفتاب
رات کو آنسو بہانا رشکِ صد شبنم ہوا

کر نہ تو ہرگز شکایت قولِ عاشق یاد رکھ
طالبِ دیدار کو غم راحتِ اعظم ہوا

۹ فروری ۱۹۱۳ء غیر مطبوعہ

عشقِ حقیقی جب مرا ایمان ہو گیا
پھر تجھ کو ایک گبر و مسلمان ہو گیا

داغِ گنہ دُھلے عرقِ انفعال سے
دشوار تھا یہ کام پر آسان ہو گیا

بویا کیے جو تخمِ بدی کشتِ دہر میں
پھل یہ ملا کہ باغ ہی ویران ہو گیا

پوشیدہ ہے بغل میں چھری منہ میں رام رام
ایمان اس شعار پہ قربان ہو گیا

عزت کے بدلے آپ نے ذلت قبول کی
طالبِ فہیم ہو کے بھی نادان ہو گیا

۶ مئی ۱۹۱۵ء غیر مطبوعہ

کیا ہی رتبہ حاصل میرے دامنِ گریباں کا
لباسِ تن مرا چاکوں سے اک گل ہے گلستاں کا

بنے کانِ جواہر بحر میری اشک ریزی سے
صدف کو بھول جائے دل سے اک دم فیض نیساں کا

یہ حالت ہے کہ جیسے برگِ گل پر قطرۂ شبنم
ہو لگے ایک چھینٹے پر گماں ہے چشمِ گریاں کا

تمہارا روئے روشن دیکھ پائے گر شۂ خاور
نکلنا پھر نہ ہو ممکن فلک پر ماہِ تاباں کا

غضب ہے ہو کے آزردہ ترا محفل سے اُٹھ جانا
شکستِ رنگِ گل سے رنگ اُڑتا ہے گلستاں کا

ہوئے گمراہ ہم راہِ محبت میں یہ ظلمت ہے
سراب اپنے لیے ہے نقش گویا پائے جاناں کا

ڈراتا کس لیے ہی وصل میں پھر خوف ہجراں کا جو گھر میں صدر کی جا ہو وہی مسکن ہی مہماں کا	جہیں گر رنگ ہی ہفت شیخ سبز دیتا ہی جگہہ دوں ہی غمِ دلدار کو کیونکر نہ سینے میں

گیا جب شانہ بیں کے پاس طالب ہاتھ دکھلانے
کہا نقشہ ہی دیکھا میں تری قسمت کی حرماں کا

کچھ عرصہ ہوا کہ پنڈت زندہ کول صاحب ثابت کاشمیری بی۔اے نے ایک غزل تصنیف فرمائی تھی جو چند دنوں کے بعد سری پرتاپ کالج میگزین میں طبع ہوئی۔ اس کا مطلع ہی ؎

آمرے راہ نما مجھ پہ کرم کر آجا
رہ گیا ہوں رہِ دشوار میں سسند آجا

اس کی ایک نقل مولوی امیرالدین صاحب امیر کاشمیری کو کہیں سے ہاتھ آئی۔ مولوی صاحب پرانی وضع کے ایک کہنہ مشق شاعر اور قابلِ قدر بزرگ ہیں۔ اتفاق سے جو میری ملاقات اُن سے ہوئی۔ اس غزل کا ذکر کیا اور فرمایا۔ تم بھی اسی زمین میں ایک غزل لکھو۔ میں نے اُسی وقت صرف مولوی صاحب کو خوش کرنے کی خاطر مذاقاً ایک غزل کہی۔۔ اس کو دیکھکر کہنے لگے اپنے رنگ میں خوب ہے اس کو ضائع نہ کرو۔ محض اس سبب سے اس کو یہاں درج کیا جاتا ہی۔ اُستاد نامدار فرماتے ہیں کہ اس میں سیّد انشا کا رنگ ہی ؎

———— ————

آکھاڑے میں جٹا دھاری قلندر آجا
لیکے ہمراہ نچلنے کوئی بندر آجا

ڈگڈگی دیکھ بجاتا ہے قلندر تیرا
لے ہنومان ادھر پھاند سمندر آجا

در پہ کیا دیکھ رہا ہے یہ تماشا اپنا
دو قدم چلنے کی تکلیف کر اندر آجا

بندیا جیج میاں حلقہ کسا ہیں ہیں
توڑنے کے لیے یہ تیر سکندر آجا

ہے سبہ دیوتا سبز پری کا دشمن
مان اس کا نہ کہا سُرگ سے اندر آجا

یہ غزل تم نے بہت خوب کہی ہے طالب
آ مرے شاعرِ عنرّا و سخنور آجا

کچھ عرصہ ہوا اردو کا ایک ماہوار رسالہ "گلشن" لاہور سے نکلنا شروع ہوا تھا اس میں اکثر ناول۔ ڈراما اور شعر و سخن سے متعلق مضامین شائع ہوا کرتے تھے اڈیٹر رسالہ نیاز مندسے بھی وقتاً فوقتاً مضامین نظم و نثر بھیجنے کی فرمائش کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ مصرعہ۔ ع۔ ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا "طرح" کے طور پر دیا گیا۔ اس پر مندرجۂ ذیل غزل لکھی گئی۔

کھلتا نہ قفل کیوں مرے بابِ امید کا
دامن جو ہوتا ہاتھ میں بختِ سعید کا

ہوں شوقِ ہمکلامیٔ دلدار پر فدا
ہے لطف بات بات میں گفت و شنید کا

کیا اعتبار ہو ترے قول و قرار پر
آج آشنا قریب کا ہے کل بعید کا

کھل جائے میری دل کی کلی بھی شگوفہ وار
لائے صبا ادھر سے جو پیغام دید کا

تشنہ ہوں تیری نعمتِ دیدار کا میں یوں
صائم ہو جیسے چشم براہ ماہِ عید کا

پامال کر رہا ہے امیدیں سمندِ ناز ، کوچہ ہے دل کا یا کوئی ٹاپ اُشومید کا

مانندِ بوئے گل اُڑے طالب جہان سے
ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا

۲ ستمبر ۱۹۱۹ء کو ایس پی۔ کالج سرینگر کی "بزمِ ادب" کا مشاعرہ منعقد کیے جانے کا نوٹس ملا۔ اور مصرعۂ طرح "حالِ دل کا آشکارا ہو گیا" پر ایک غزل لکھنے کا ارشاد ہوا۔ راقم الحروف نے اس زمین میں ۱۲۔اپریل ۱۹۱۹ء کو ایک معمولی غزل لکھی تھی اس میں ایک دو شعر بڑھا دیئے اور مشاعرہ میں سُنائی۔

طبعِ موزوں کا اشارا ہو گیا
شعر گوئی کا جو یارا ہو گیا

دل میں ہیں افکار زیرِ خاک بھی
موت بھی جینا ہمارا ہو گیا

بحرِ غفلت میں ہوئے ہیں غرق ہم
عقل و دانش سے کنارا ہو گیا

آج کل ایم۔ اے تک اس کشمیر میں
دربدر شامت کا مارا ہو گیا

عشق کو سمجھے تھے سود النفع کا
وائے ناکامی خسارا ہو گیا

لشکرِ برطانیہ کی گرد سے
خاک جرمن کا غبارا ہو گیا

آپ کی صورت سے اہلِ بزم کو
حالِ دل کا آشکارا ہو گیا

آج کل طالب زمینِ شعر پر
اپنا قبضہ اور اجارا ہو گیا

۳ جنوری ۱۹۲۰ء مطبوعہ "معیارِ سخن" ضلع ناسک

گیا دل ہاتھ سے اور دلستاں کے ہاتھ کیا آیا
اُڑا آنکھوں میں مطلب لانے والوں کے ہاتھ کیا آیا
مری آنکھوں میں حسنِ یار کی تصویر پنہاں تھی
تو میرے روکنے سے پاسباں کے ہاتھ کیا آیا
بہارِ گلستانِ حسن ہم نے لوٹ لی ساری
بتا اے مرگ اب تیری خزاں کے ہاتھ کیا آیا
ہمارے دل میں اترے تم کسی کے مہماں ہو کر
خدا لگتی جو کہیے میزباں کے ہاتھ کیا آیا
یہ مردہ حسرتیں یہ داغِ سوزاں چند تحفے
کوئی پوچھے کہ میرے دستاں کے ہاتھ کیا آیا
نہ غربی بن سکا ہاں شرقیت اپنی گنوا بیٹھا
تتبع سے بھلا ہندوستاں کے ہاتھ کیا آیا

فصاحت اور بلاغت ہاتھ ملتی رہ گئی طالب
کہو اے اہلِ دل اہلِ زباں کے ہاتھ کیا آیا۔

۲۰ اپریل ۱۹۱۶ء مطبوعہ "پیسو نسخہ" لاہور

نکالے دل کے ارماں ہم نے پیری میں جواں ہو کر
کہوں کیا جورِ گردوں کی میں تم سے فتنہ پردازی
خیالِ یار کو سمجھے تھے ساکن خانۂ دل کا
زبانِ حال سے ظاہر ہے میری خانہ بربادی

قدرِ خم نے دیا تیروں کا کام آخر کماں ہو کر
سمایا چشمِ دلبر میں بھی رنگِ آسماں ہو کر
جو کھسکا دل ہی پہلو سے گیا دل مکاں ہو کر
ہوں لبریز فغاں حیرت میں گویا بے زباں ہو کر

نگاہِ یار کا منظور جسمِ ناتواں ہوتا
مگر اس لشکرِ مژگاں نے روکا پاسباں ہو کر

خدا حافظ کہا داڑھی کو ہم نے مُنہ پہ جو پھوٹی
جوانی پر نہ قابو پا سکے پیرِ مغاں ہو کر

نہیں ہونگے نہوں ہم کارنامے عشق کے لیکن
رہینگے صفحۂ ہستی پہ قائم داستاں ہو کر

بجائے دلبر[1] طالب بنا ہوں طالبِ دلبر
کہ دامنگیر بنا ہوں میں اب دامن کشاں ہو کر

سال گزشتہ میں دیوان پنڈت رادھے ناتھ صاحب کول۔ المتخلص بہ گلشن رئیس لاہور نے الہ آباد میں بڑے صرف سے ایک دو عالیشان مشاعرے منعقد کرائے۔ یہ غزل دوسرے مشاعرے کی طرح پر ہے۔ جس کی مفصل رپورٹ "بہارِ گلشن" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ سر ڈاکٹر تیج بہادر صاحب سپرو۔ ایم اے ایل ایل۔ ڈی۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی اس اجلاس کے صدر منتخب کیے گئے تھے اور طرح یہ تھی ع

ہمارا نالۂ دل کیا کریگا با اثر ہو کر

جنوں انگیز ہی رازِ محبت راہبر ہو کر
گریباں گیر ہی دستِ اجل بیداد گر ہو کر

نہیں ہے بے سبب لگتا ٹھکانے بیقراری کا
امیدِ وصل اب آ رہی ہے نامہ بر ہو کر

اُلجھتی آرزو تھی خارِ دامن کی طرح ہم سے
چرا لی ہے نگاہیں اب ہماری ہم سفر ہو کر

[1] راقم پہلے دلبر تخلص کرتا تھا۔ (طالب)۔

بہ رنگِ دودِ آہ دل تمنا کی ہوا بگڑی | غبارِ آتشِ حسرت اُڑا ہی تو جہ گم ہو کر
وہ عاشق ہوں کہ وحشت میں کبھی یادِ یار کی | خودی میں بے خبر اور بیخودی میں باخبر ہو کر
طبیعت ہو گئی بیزار اُس کی نارسائی سے | ہمارا نالۂ دل کیا کریگا با اثر ہو کر
وہ عشقِ صادق و رسمِ وفا کے جب نہیں قائل | ہمارا نالۂ دل کیا کریگا با اثر ہو کر
دُعا سے ان کی آخر نارسا کیونکر نہ ہو جاتا | ہمارا نالۂ دل کیا کریگا با اثر ہو کر

انھیں منظور تھا شاید ہمارا امتحاں طالب
نہ نکلے اشک بن کر جو کبھی لختِ جگر ہو کر

مخدومی و معظمی پنڈت اقبال کشن صاحب شرگا بی۔ اے۔ ایف۔ اے یو۔ سابق پرنسپل سری پرتاپ کالج سری نگر راقم کے خاص مہربانوں میں سے ہیں آپ اپنے وقت میں ہر سال بہار کے موقع پر کالج میں ایک عالیشان جلسہ منعقد کراتے تھے جس میں آپ ریاست کے تمام رؤسا و افسرانِ بالا۔ طلبا اور پروفیسروں کو مدعو کر کے چاء اور مٹھائی وغیرہ سے کافی خاطر تواضع کرتے تھے۔ چونکہ یہ موقع اظہارِ مسرت و خوشی کا سمجھا جاتا تھا۔ گانے بجانے کا انتظام بھی ہوتا تھا مختلف احباب و بزرگانِ وطن اور طلبا مختلف قسم کی تقریریں کرتے تھے نیازمند سے بھی ایسے موقعوں پر بہاریہ غزل لکھنے کا ارشاد ہوتا تھا۔ بلکہ یہ ہمیشہ پروگرام کا ایک ضروری جزو سمجھا جاتا تھا۔ اپریل ۱۹۱۸ء کے جلسۂ بہار میں مندرجۂ ذیل غزل سنائی گئی اور بعد ازاں پنڈت شرد رجو کاچرو بی۔ اے نے بلجے پر گا کر سنائی۔ اول سری پرتاپ کالج میگزین اور پھر کچھ عرصے کے

بعد لکھنؤ کے رسالہ "دھورندھر" میں شائع ہوئی۔

واہ وا آئی ہے کیا اب کے گلستاں میں بہار
باغ میں جنگل میں کالج میں دبستاں میں بہار

ہاتھ میں کنگنا ہے پھولوں کا تو سر پہ چترِ گل
پھول چھنٹنے سے ہے کیا گل رو کی داماں میں بہار

جھومتے ہیں جوشِ مستی میں جوانانِ چمن
ہار کیا پہنا چھپا رکھی گریباں میں بہار

آئے گل گشتِ چمن کو زیورِ گل ہیں لیے
قمریو آئی ہے کیا سرو خراماں میں بہار

چہرۂ معشوق پر بکھرے ہیں گیسوئے سیاہ
یا یہ اترائی ہے آئی سنبلستاں میں بہار

چھپائے شادمانی میں نہ کیونکر عندلیب
سال بھر کے بعد آئی باغ و بستاں میں بہار

چشمِ نرگس کھل گئی مخموریِ شب ہے کیا
یا نسیمِ صبح لائی ہے شبستاں میں بہار

حقۂ یاقوت میں قدرت نے ہیں موتی جڑے
یا کسی کے ہے بھری لب اور دنداں میں بہار

چہرۂ گل پر پڑے ہیں قطرۂ اشکِ عندلیب
ابرِ نیساں کی طرح ہے چشمِ گریاں میں بہار

شنکر اچارج[1] کا نقشہ آبِ ڈل میں ہے عیاں
یا یہ ہے تختِ سلیماں کی پرستاں میں بہار

کیوں نہ ہو بشاش ہر اک برکتِ اقبال[2] سے
آئی ان کے دم سے ہے کالج کی ایواں میں بہار

دیکھیے تو خامۂ طالب کی یہ گلکاریاں
کھل رہی ہے واہ کیا فصلِ بہاراں میں بہار

[1] شنکر اچارج کا پہاڑ کشمیر میں مشہور ہے جو مشہور مقام جھیل ڈل کے کنارے واقع ہے اس کا عکس پانی میں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی چوٹی پر پتھر کا ایک قدیم مندر ہے جس کو ہندوستان کشمیر نہایت متبرک مانتے ہیں۔ اس کو تخت سلیمان بھی کہتے ہیں [2] پنڈت اقبال کشن صاحب شرگا پرنسپل کالج کی طرف اشارہ ہے (طالب)

ذیل کی غزل بھی سالانہ جلسۂ بہار - ایس پی - کالج سری نگر کے موقع پر ۰ - اپریل ۱۹۱۹ء کو ہال میں پڑھی گئی تھی - حاضرین کی تعداد جن میں روسائے کشمیر اور دیگر اہلکارانِ ریاست بھی شامل تھے - قریباً دو ہزار تھی - غزل اول تو خاکسار طالب نے پڑھی اور پھر پنڈت کشن کمار نکرو جی - اے نے اس کو باجے پر گا کر حاضرین کو محظوظ کیا - کچھ مدت کے بعد "نظام" لاہور اور شیو شمبھو لاہور میں شائع ہو گئی

واہ وا کس شان سے پھر آ کے آتی ہے بہار
اک نیا انداز گلشن میں دکھاتی ہے بہار

نوجوانِ چمن سرشار ہیں اس دور میں
میکشوں کو مژدۂ راحت سناتی ہے بہار

روحِ تازہ پھونکتی مردہ دلوں میں ہے صبا
عیسوی اعجاز سے مردے جلاتی ہے بہار

کا کلیں کھولے ہوئے ہیں نو عروسانِ چمن
نافۂ سنبل سے خوشبوئیں اڑاتی ہے بہار

ہر کوئی محوِ تماشائے جمالِ یار ہے
ناچتی پھرتی صبا ہے اور گاتی ہے بہار

سبزۂ غلطیدہ ہے گویا مصلّے پھول کا
کیا نمازیں عندلیبوں کو پڑھاتی ہے بہار

غنچۂ سربستہ کہنے کو ہے اپنا حالِ دل
راز کلیوں کی چٹک سے کہہ سناتی ہے بہار

غازۂ خوشرنگ سے کرتی ہے تازہ روئے گل
اور کفِ محبوب میں مہندی رچاتی ہے بہار

کر نہیں سکتا بیاں کچھ طالبِ کج مج زباں
دیدۂ بینا میں رنگ اپنا جماتی ہے بہار

۲۴ جولائی ۱۹۱۹ء کو میرے دوست پنڈت شام لال صاحب کول ہیڈ ماسٹر سٹیٹ سکول خانیار رسالہ "کمال دہلی" کا پرانا پرچہ کہیں سے لائے

اور اس میں سے چند طرحی غزلیں پڑھ کر سنائیں۔ ایک زمین میں راقم سے بھی ایک غزل کہنے کی فرمائش کی۔ چونکہ وہ شعر و سخن کے دلدادہ ہیں۔ خود ہی لکھنے کی خواہش ظاہر کی میں ایک ایک شعر کہتا گیا۔ اور وہ لکھتے گئے۔ غزل حسب ذیل ہے۔

مہماں ان کا ہوگیا کیا بن بلائے دل ۔۔۔ اُٹھنے کی جب میں ٹھان لوں تو پھر بٹھائے دل
اس طرح کون ہے جو جلائے بجھائے دل ۔۔۔ یارب کسی بشر پہ کسی کا نہ آئے دل
جس کو رفیق سمجھے تھے نشتر سے کم نہیں ۔۔۔ پہلو میں ایک خار ہے میرے بجائے دل
جن کے سروں پہ عشق کا جن ہوگیا سوار ۔۔۔ کرتے پری کی یاد میں ہیں ہائے ہائے دل
سوداگراں ہے حسن کا کیا مول لے سکیں ۔۔۔ اس کے مقابلہ میں ہے ارزاں بہائے دل
بچپن کا ایک رفیق تھا اب وہ بھی چھٹ گیا ۔۔۔ دل میرا آشنا ہے نہیں آشنائے دل

ستمبر سنہ ۱۹۱۶ء کو راقم اپنے ایک عزیز دوست پنڈت نرنجن ناتھ صاحب ور بی۔ اے متعلم۔ ایل ایل۔ بی کلاس الہ آباد کی ہمراہی میں شام کے وقت نشاط باغ کی سیر کر کے کسنی پر واپس آ رہا تھا۔ آسمان پر سفید و سیاہ بادل چھا رہے تھے۔ ان کا عکس ڈل کے شفاف پانی میں نہایت خوشنما نظر آ رہا تھا۔ میرے دوست اس کی طرف اسارہ کر کے فرمانے لگے۔ دیکھیے کیا دلربا منظر ہے۔ کیسی دورنگی ہے۔ میں نے کہا نظارہ واقعی قابلِ دید ہے۔ اسی طرح دنیا میں کوئی چیز دورنگی سے خالی نہیں۔ بلکہ ہر حالت میں اس طرح موجود رہتی ہے جس طرح تصویر کے دو رخ سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً نیکی و بدی۔ رنج و راحت نفع و نقصان وغیرہ

فرمایا۔ ایک غزل اس پر لکھیے۔ ان کے ارشاد کی تعمیل میں یہ غزل لکھی اور اخبار "عام" لاہور اور سناتن دھرم پرچارک "امرت سر" میں شائع کیے جانے کی غرض سے بھیج دی۔ ان میں چھپنے پر دیگر رسائل و اخبارات۔ مثلاً شیو شنبھو لاہور۔ رفیق التعلیم لاہور۔ طریقت لاہور۔ مستانہ جوگی لاہور۔ دربار لکھنؤ۔ پریم بلاس۔ گوجرانوالہ "اتحاد" امرت سر وغیرہ میں طبع ہوئی۔

اس دو رنگی کے اثر سے ہیں عجب عالم میں ہم
زندگی بخش آب حیواں ہیں مع زہر قاتل سم بھی ہوں

دل میں کھب جاتا ہوں سنتے پا کے راہِ گوش کا
بن کے اک مضموں کبھی اخبار کے کالم میں ہوں

ہوں ہر اک ذرہ میں روشن جس طرف آنکھ اٹھا
چرخ میں مہر و ماہ میں ہوں نیرِ اعظم میں ہوں

دم رگِ بسمل میں ہوں اور خنجرِ قاتل میں آب
شورِ بلبل بوئے گل اور قطرۂ شبنم میں ہوں

بازوؤں میں پہلوانوں کے ہوں میں تاب و تواں
گرز میں سہراب کے اور خنجرِ رستم میں ہوں

میں نہیں رونے سے تھکتا مثلِ ابرِ برشگال
اور خنداں برق سا برسات کے موسم میں ہوں

بحرِ ہستی کا ہے ساحل دور میں نا آشنا
کیا مجھے معلوم کیا ہوں اور کس عالم میں ہوں

دل نہیں پہلو میں تو پھر کیا ہو امیدِ نشاط
ہو نہیں سکتا میں شاداں مبتلا اس غم میں ہوں

یا تو طالب ہے جنوں یا عہدِ طفلی کا سماں
اس دو رنگی کے اثر سے میں عجب عالم میں ہوں

۲۷ مئی ۱۹۱۶ء۔ مطبوعہ "شیو شنبھو لاہور" و "الہلال" دہلی

وحشت[ط] سے میری گھر بھی بیاباں سے کم نہیں
جوشِ شباب چاک گریباں سے کم نہیں

زخمِ جگر کی تشنگی اے ہمنشیں نہ پوچھ
ہر شورِ نالہ شورِ نمکداں سے کم نہیں

[ط] یہ غزل میرے مکرم دوست میاں نظام الدین صاحب بی۔ اے سابق اسسٹنٹ

کنجِ قفس میں بیٹھ کے سیرِ زمانہ کی ... مجلس بدن کا گلشنِ امکاں سے کم نہیں

سوزِ دروں نے پھونک دیا سر سے پاؤں تک ... جسمِ نزار سروِ چراغاں سے کم نہیں

ہے اضطرابِ شوقِ نقابِ رُخِ امید ... تارِ نگاہ پردۂ مژگاں سے کم نہیں

مال و متاعِ یادِ حسیناں کو جا نہ تھی ... بازارِ دل کا گوشۂ زنداں سے کم نہیں

حسرت کی تیرہ بختی میں لوٹی بہار کیا ... داغِ جگر بھی شمعِ شبستاں سے کم نہیں

طولِ شبِ فراق کا چمکا ستارا کیا ... داغِ جگر بھی شمعِ شبستاں سے کم نہیں

ہمراز اپنا کون تھا بزمِ رقیب میں ... ارمانِ دل بھی دیدۂ حیراں سے کم نہیں

اصلاح اچھے اچھوں کو مل جاتی ہے یہاں ... بزمِ مشاعرہ بھی دبستاں سے کم نہیں

کیونکر دل و جگر کو نہ کرتا فدائے دوست
طالب خیالِ یار کا مہماں سے کم نہیں

۳ مئی ۱۹۱۲ء غیر مطبوعہ

سچ یہ کہتا ہوں بہانہ میں کوئی کرتا نہیں ... زندگی سے آ گیا ہوں تنگ مگر مرتا نہیں

یا تو دل میں جھگڑے دن رات رہو کے تھے ... یا خیالِ غیر بھی اس میں قدم دھرتا نہیں

قتل کرنے کے لیے آ و مگر دیدار دو ... مثلِ پروانہ میں تو شمع سے ڈرتا نہیں

جانتا ہوں جان دینا گو جفائے یار پر ... اس پہ بھی لیکن وفا کا میں تو دم بھرتا نہیں

نام ہی طالب ہے پھر کیونکر طلب ہو بے غرض
سچ یہ کہتا ہوں بہانہ میں کوئی کرتا نہیں

۷ رجون ۱۹۱۱ء غیر مطبوعہ

پردہ جو درمیاں ہے حائل اُتار دیں ... غفلت کا چشمہ آنکھ سے غافل اُتار دیں

تدبیر میرے قتل کی کرتے ہو کیوں عبث	سر میرا ایک ہاتھ میں قاتل اتار دیں
[illegible] بوسہ عطا نہ ہو	سودائے خام سر سے یہ سائل اتار دیں
یکتائے روزگار مصور ہیں آپ اگر	تصویر یاس و حسرت کامل اتار دیں
کیا وہ نہ آئیں بیٹھو بھی ہے خانۂ دل وہ چیز	محمل سے لیلیٰ ناقہ سے محمل اتار دیں
ہو التجا تو یہ کہ نہ اٹھوائیں غیر سے	سر میرا شوق سے سر محفل اتار دیں

۴ اگست ۱۹۱۵ء غیر مطبوعہ

نہیں معلوم خود مجھ کو کہ کیا ہوں میں کہاں ہوں میں
کبھی ہوں نارِ دوزخ گاہ گلزارِ جناں ہوں میں
شکایت دور کے یاروں کی اک بے جا حکایت ہے
دلِ مشفق جو پہلو میں ہو اس سے بدگماں ہوں میں
ہر اک موئے بدن ہے سو زباں سے نوحہ خواں میرا
اگر سمجھے کوئی یہ راز گویا بے زباں ہوں میں
یہی ڈر ہے کہ گر جاؤں نہ اپنے آشیانہ سے
کہ مثلِ قطرۂ اشک آنکھ کے اندر نہاں ہوں میں
برا ہوں یا بھلا ملکِ سخن میں اس سے کیا مطلب
برنگِ نقشِ پا پھر بھی نشانِ رفتگاں ہوں میں
گلستانِ جہاں تازہ ہے میری خوش نوائی سے
میں بلبل ہوں ہزاروں میں بہارِ بے خزاں ہوں میں

یہی بہتر ہے وہ ستار دونوں کا بھرم رکھے
کہ دل میرا ہے واقف اور اس کا رازداں ہوں میں

نہ پوچھو کون ہوں طالبؔ بقولِ حضرتِ کیفی
بتا دوں کس طرح تم کو کہ کیا ہوں میں کہاں ہوں میں

۶ - اپریل ۱۹۱۶ء - مطبوعہ "طریقت" لاہور

گو بظاہر شکلِ انسانی ہوں میں — ایک عکسِ نورِ یزدانی ہوں میں
دوزخ و جنت میں ہوں جلوہ نما — رنج اور راحت کا خود بانی ہوں میں
میری ہستی کو فنا ہرگز نہیں — اور تعجب یہ کہ پھر فانی ہوں میں
نقشِ اوّل میں بنا میرا وجود — اس پہ بھی تو طالبِ ثانی ہوں میں
جن کے امرت ہوں امر کرتا کبھی — زہر بن کر دشمنِ جانی ہوں میں
گہ درخشاں مثلِ مہرِ نیمروز — گہ مثالِ ابرِ ظلمانی ہوں میں
دیر ہو یا ہو کلیسا یا حرم — شمع ہوں ہر گھر میں نورانی ہوں میں

دہر میں طالبؔ نہیں ہمسر مرا
صورتِ ہستی حقانی ہوں میں

۲۵ مارچ ۱۹۱۶ء مطبوعہ شیو شنبھو - لاہور

چمن کو چھوڑ کر چپ چاپ بلبل ہے نشیمن میں — ترانوں کا نہیں کچھ لطف باقی اب گلشن میں
شہیدِ یاس و حسرت ہوں مری ہے دھوم گمانی سے — نشاں جیتے کا مل سکتا ہے کب عصمت کے دامن میں
مری فریاد کی ظالم خوشی سے داد دیتا ہے — صدائے ساز ہے یا سوزِ مضطر ہے شیون میں
بہارِ گلستاں ظاہر ہمارے خاکداں سے ہے — پرِ طاؤس داغوں سے شجر بنتا ہے گلشن میں

چھما چھم ابر باراں کی طرح آنسو برستے ہیں
شکستہ ہو گئے اشکوں کے ڈریلے دامن میں

بشر تو دار فانی میں چڑھا گویا ہے سولی پر
ہوا و حرص کا پھندا پڑا ہے اس کی گردن میں

اسیر رشتۂ الفت کا طالب چھوٹتا کیسا
ارے ناداں مقید تو نہیں زنجیر آہن میں

۲۹ ستمبر ۱۹۱۴ء غیر مطبوعہ

کہتا ہی طفل اشک کہ جینے سے تنگ ہوں
ڈوبوں نہ کیوں کہ ساکن دریائے گنگ ہوں

یارب ہو دل کی خیر کہ پھر آج بے طرح
آماجگاہ یک نظر شوخ و شنگ ہوں

مرتا نہیں ہوں ہجر میں گو جاں لبوں پہ ہے
نرمی میں مثل موم ہوں سختی میں سنگ ہوں

میرا اقبال کیوں نہ فلک سیر ہو بھلا
ہیں مست جام بادۂ مینائے بنگ ہوں

پہنچوں گا تا بہ چشمہ میں آشنا نہ تک
وہ مرغ بہ شکستہ پر ہوں اور پائے لنگ ہوں

یہ آگ میری بجھ نہ سکے آب اشک سے
کافور ہوں کہ پانی میں بھی شعلہ رنگ ہوں

طالب مرا تو دہر میں مسلک ہی صلح کل
یعنی کہ میں کسی سے نہ مشغول جنگ ہوں

۹ فروری ۱۹۱۶ء غیر مطبوعہ

کبھی میں نغمہ زن طوبیٰ پہ ہم رنگ عنادل ہوں۔
کبھی میں صورت غنچہ کسی دل تنگ کا دل ہوں
کبھی شاداں ہوں قربت سے کبھی نالاں ہوں فرقت سے
کبھی ناچار عسرت سے کبھی عشرت سے واصل ہوں

کبھی تادیب غیروں کی کبھی تہذیب خود اپنی
کبھی ایک واعظِ عاقل کبھی اک مردِ عامل ہوں

کبھی خواہندہ ہوں مے کا نوازندہ کبھی نے کا
کبھی اک طفلِ ابجد خواں کبھی اُستاد و کامل ہوں

کبھی گل کا ورق بن کر دکھایا جلوۂ کثرت
کبھی میں صورتِ تخم و ثمر وحدت میں شامل ہوں

کبھی باغِ جہاں میں صورتِ تالاب ساکت ہوں
کبھی سیلاب ہو کر شہر و ویرانہ بہ مائل ہوں

ٹھکانا بے حیائی کا ڈھٹائی کی کوئی حد بھی
عجب دنیا بہ مائل ہوں غضب عقبیٰ سے غافل ہوں

مرا تسلیم شیوہ ہے میں عاجز بن کے جھکتا ہوں
ہلال آسا اسی سے آسماں پر خوش شمائل ہوں

دغا کی راہ میں اک بے سر و ساماں مسافر ہوں
نہیں معلوم غافل کس سے ہوں اور کس پہ مائل ہوں

عجب نیرنگ کے کھینچے ہیں طالب نقشِ عالم میں
جو دلدادہ ہوں بسمل ہوں جو دلبر ہوں تو قاتل ہوں

۱۰ اپریل سنہ ۱۹۱۴ء - مطبوعہ "دربار" لکھنؤ "پریم بلاس" گوجرانوالہ

پی کر مئے محبت سرشار ہو رہا ہوں
[illegible] جاناں کی دل میں صورت سمائی

دنیا سے بے خبر ہوں ہشیار ہو رہا ہوں
رنگِ دوئی مٹا کر دلدار ہو رہا ہوں

دشمن کی دشمنی کا دل میں کسے ہو کھٹکا
میں پیار ہو کے جزوِ اغیار ہو رہا ہوں

توام جو پیچ وصاحت ہیں گلشنِ جہاں میں
میں پھول ہو رہا ہوں اور خار ہو رہا ہوں

میری نظر میں یکساں ہیں شیخ اور برہمن
میں چھوڑ کر تعصب دیندار ہو رہا ہوں

حاجت نہیں ہے طالب دی کوئی ساتھ میرا
میں خود ہی ساتھیوں کا غمخوار ہو رہا ہوں

۲۷۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء۔ غیر مطبوعہ

خواہشِ بیجا سمائی ہے جوان و پیر میں
ہے مگر ملتا وہی لکھا ہے جو تقدیر میں

رہ کے دنیا میں نہ ہوں گر طالبِ دیدارِ یار
آرزوئے وصل کیا ہو، روز و دار و گیر میں

روسیاہی کے سوا دیکھا نہیں سنے عمر بھر
نقشِ پیشانی نگیں تھا کیا میری تقدیر میں

بلبلِ تصویر بول اٹھتا ہے وہ خاموش ہے
کیا بھرا جادو ہے یارب یار کی تصویر میں

وہ سمجھتے ہیں محبت کو ہماری دل لگی
عفو پنہاں ان کا ہے اس جرم کی تعزیر میں

غالباً تھا رات بھر وہ ساکنِ دیرِ خراب
آج پاتے ہیں اثر کچھ شیخ کی تقریر میں

میں ہوا طالب تو رسوا سب زمانہ ہو گیا
وہ ہوا مطلوب تو بڑھ چڑھ گیا توقیر میں

۱۰ اپریل ۱۹۱۱ء مطبوعہ وسبار لکھنؤ

پیری کا دغدغہ ہے جو ہے دارِ خراب میں
پھر شوخیاں فضول ہیں عہدِ شباب میں

دنیا و دیں سے وہ ہوئے یکلخت بے خبر
سرشار ہیں جو بادۂ خدا کی شراب میں

دنیا میں زندگی کو جو کہتے ہیں بے ثبات
مثلِ حباب اپنے کو سمجھے ہیں خواب میں

ہم نے سوالِ وصل کیا جب حضور سے
انکار ہی کا لفظ سنا ہے جواب میں

طالب فراقِ یار میں بیدار کیا ہو بخت
دیکھی نہ ہم نے صورتِ تسکیں بھی خواب میں

منشی محمد الدین صاحب فوق ایڈیٹر "کشمیری میگزین" لاہور کچھ عرصے تک اخبار کے
ادہ ایک اور رسالہ "طریقت" شائع کرتے رہے۔ رسالہ تصوف کے رنگ میں
یا ہوا تھا۔ اس مجموعے کی چند غزلیں اس رسالے میں بھی وقتاً فوقتاً نکلتی رہیں۔
ں کا حوالہ ان نظموں کے ساتھ دیا گیا ہے۔ ذیل کی نظم بھی چونکہ اسی رنگ میں
ں۔ رسالہ مذکور میں شائع ہوئی۔ کچھ مدت کے بعد صوفی لچھمن پرشاد صاحب
یٹر رسالہ "مستانہ جوگی" کے طلب کرنے پر ان کے پاس بھیجدی گئی اور اس میں
ی شائع ہوئی۔ یہ نظم دراصل ۱۷۔ اگست ۱۹۱۰ء کو لکھی گئی تھی۔

ھی گل کی طرح کھلتا رہا میں لالہ زاروں میں
کبھی وحشت زدہ ہوں مثلِ مجنوں خارزاروں میں
ھی بت کو بٹھا کر سامنے پوجا میں کرتا ہوں
کبھی جپتا ہوں نام اللہ کا اللہ کے پیاروں میں
ھی یادِ الٰہی میں مگن پرہلاد کی صورت
گرایا کوہساروں سے تو جا پہنچا میں غاروں میں
ھی منکر خدا کی ذات سے شکل ہرن بنکر
حقیقت سے رہا غافل ہوں میں بے اعتباروں میں

مثالِ گوتم دانا کبھی دنیا سے منہ موڑا
رہا ہوں مدتوں اپدیش کرتا میں ہزاروں میں
نمایاں کرشن کی صورت میں گا ہے دوارکا میں ہوں
کبھی میں مادھوبن میں کھلتا پھرتا تھا پیاروں میں
کبھی بن باس لیکر رام کی مانند چل نکلا
کبھی میں فوجِ راون کی طرح آیا قطاروں میں
کبھی آیا نگاہوں میں مجسم رحم کا فوٹو
کبھی بے رحم بن کر جنگ کی ہے کارزاروں میں
کبھی گلشن میں رنگِ گل کی کثرت دیکھا رہی میں نے
دکھایا نقشۂ وحدت کا لٹکا گل کے ہاروں میں
کبھی موٹی سی باتوں کے سمجھنے میں رہا قاصر
کبھی مطلب نکالا میں نے معمولی اشاروں میں
کبھی میں مہرِ تاباں بن کے چمکا آسمانوں پر
کبھی فرشِ زمیں پر جا ملا ہوں خاکساروں میں
شریکِ غم کسی کا ہو کے میں نے غمگساری کی
کبھی مرگِ عدو کے میں رہا ہوں سوگواروں میں
کبھی آبِ رواں بن کر علاجِ تشنہ کامی ہوں
کبھی ہوں برقِ خرمن سوز بجلی کے شراروں میں

کبھی جنبش نہ کی اپنی جگہ سے بے ستوں ہو کر
کبھی بے جانِ شیریں کوہ کن ہوں بیقراروں میں

کبھی میرا کہا قائم رہا نقشِ حجر کا سا
کبھی حرفِ غلط کی طرح ہوں بے اعتباروں میں

کبھی مانندِ آئینہ بنا پریوں کے جھرمٹ میں
کبھی سکتے میں مثلِ لوح ٹھہرا ہوں مزاروں میں

کبھی ہستی بھی میری نیستی راہِ فنا میں ہے
کبھی اس نیستی سے ہست ہوں عالی تباروں میں

کبھی ہوں دم بخود لب پر لگا کر مہرِ خاموشی
کبھی ہوں گنبدِ گردوں پہ آوازہ پکاروں میں

غرض ہیں عالمِ ایجاد میں کامل رہا طالبؔ
کیا ہے رازِ وحدت فاش میں نے کیا اشاروں میں

۲۷ نومبر ۱۹۱۱ء - غیر مطبوعہ

یار سے ملنے پہ ظاہر بیقراری کیا کروں
ہو کہ پیشانی میں ہو وہ پیش آتی ہے ضرور
خاک میں مل کر بھی قسمت میں نہ تھا دیدارِ یار
یار کی آمد تھی دم چلتے چلتے رک گیا
اس تنِ لاغر میں اب تاب و تحمل ہے کہاں
اب بیچارہ حال کو دیکھ کر بے خود ہوا

شے جو ناممکن ہو اس کی خواستگاری کیا کروں
اپنے تختِ بد کو پیٹوں آہ و زاری کیا کروں
اوج پر جانے کی خاطر خاکساری کیا کروں
زندگی پائی دوبارہ دم شماری کیا کروں
ہے سوالِ زندگی بھاری ہی بھاری کیا کروں
چھپ نہیں سکتی حقیقت وضعداری کیا کروں

تقریباً تین سال کا عرصہ ہوا۔ کہ اپنے ایک دوست پنڈت دینا ناتھ صاحب دلگیر کی بدولت سید علی حیدر صاحب طباطبائی المتخلص بہ نظم کی مولفہ شرح دیوان غالب راقم کی نظر سے گذری۔ اس میں فاضل شارح نے اکثر اشعار کی شرح کی شرح کرتے ہوئے علم و ادب کے مختلف نکات اور مشاعروں کا ذکر کیا ہے چنانچہ اس شعر ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

کے دوران شرح میں مصرعۂ دوم پر اپنی طرف سے چند مصرعے بطور تضمین لگائے ہیں بلکہ اس کے علاوہ اس مشہور مصرعہ "اس لیئے تصویر جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں" کی تضمین بھی مختلف مصرعوں سے کی ہے۔ راقم نے بھی دونوں مصرعوں پر چند مصرعے لگا دیئے اول مصرعہ کی تضمین ردیف (ے) میں ملاحظہ ہو۔

صورت بیجاں ہمیں اس کی پسند آئی نہیں	اس لیئے تصویر جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں
دل کے آئینے میں آتا ہے نظر آٹھوں پہر	〃 〃 〃 〃
لطفِ صحبت میں ہمارے غیر ہو جاتے شریک	〃 〃 〃 〃
کھینچنے دیتی نہ اس کو حسن کی اپنے کشش	〃 〃 〃 〃
بھول کر بھی بھولنا اس کا کبھی ممکن نہ تھا	〃 〃 〃 〃
دھیان میں دلدار کے سب لطف حاصل ہی ہیں	〃 〃 〃 〃
کھینچنے پاتا مصور بھی نہ کب دیتا ہمیں	〃 〃 〃 〃
حاسدان فتنہ گر بدظن بنا دیتے اُسے	〃 〃 〃 〃

کاغذی فوٹو ہی رکھنا ظاہری عاشق کا کام — اس لیے تصویرِ جاناں ہم نے کھچوائی نہیں
غالباً مطلوب کی ہستی نہ طالب کو طلب
〃 〃 〃 〃 〃 〃

۷ راگست ۱۹۱۵ء غیر مطبوعہ

تھکے ہیں پاؤں سانس اکھڑا ہی کیا ناچار بیٹھے ہیں
ہی دم آنکھوں میں بھر حسرتِ دیدار بیٹھے ہیں

تمہاری یاد ہی دل میں تمہارا ہی تصور ہے
سر بالیں برائے نوحہ سب غمخوار بیٹھے ہیں

یہ خمیازہ نہیں ضبط و حیا کا گر تو پھر کیا ہے
مری میت پہ وہ اب بن کے ناہموار بیٹھے ہیں

رقیبوں سے اگر ملتا ہی دل لیکن نہ بھول اس کو
کہ تیرے وصل کے کچھ اور بھی حقدار بیٹھے ہیں

تعجب ہی کہ ہیں غنچہ دہن یہ گلبدن پھر کیوں
مرے دل میں کلام ان کے مثال خار بیٹھے ہیں

تسلی ہو مریضِ عشق کو تو کس طرح طالب
عیادت کو جو آئے لیکے ساتھ اغیار بیٹھے ہیں

۲۵ نومبر ۱۹۱۷ء مطبوعہ "شیو شنبھو" لاہور "طریقت" لاہور "اتحاد" امرتسر

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — مہرباں کوئی نہ ہو نا مہرباں کوئی نہ ہو
جس کو جی چاہے جگہ دوں اپنی آنکھوں میں اسے — پاسبانِ گلشنِ دل باغباں کوئی نہ ہو
ٹوٹ جائے میری پستی سے بلندی کا غرور — اس زمیں پر سایہ افگن آسماں کوئی نہ ہو

جائے گلشن قعر گلخن ہیں بسر کر عندلیب	تفتہ جانوں کے لیے جب گلستاں کوئی نہ ہو
جلوۂ حسن ازل تصویر حیرت کر مجھے	لب پہ حسن و عشق کی پھر داستاں کوئی نہ ہو
تا نہ جائے اے خدا شیرازۂ عالم بکھر	ہو نہ کوئی ہمنفس اور راز داں کوئی نہ ہو
صبر پہلے کر عنایت بعد اس کے درد دل	ان مرے دو دو ستوں سے بدگماں کوئی نہ ہو
فکر سے آزاد ہوں عزلت نشینی ہو پسند	ہر جگہ میرا ہو ڈیرہ اور مکاں کوئی نہ ہو

آگیا ہوں تنگ طالب گردش افلاک سے
رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

ماہ اگست ۱۹۲۲ء میں لالہ سری رام صاحب دہلوی۔ ایم۔ اے۔ مولف "خمخانۂ جاوید" سیر و سیاحت کی غرض سے کشمیر تشریف لائے۔ انھیں دنوں میں منشی فیروز الدین صاحب طغرائی۔ مولانا حفیظ اور دیگر چند شعرا پنجاب سے کشمیر آئے ہوئے تھے خاکسار نے قبلہ و کعبہ جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی اسسٹنٹ فارن سکریٹری ریاست جموں و کشمیر سے درخواست کی کہ لالہ صاحب کی شان میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ صاحب موصوف نے منظور فرمایا۔ چنانچہ ۹ ستمبر مشاعرے کی تاریخ مقرر کی گئی اور سری پرتاب کالج ہال میں منعقد ہوا۔ جناب چودھری خوشی محمد صاحب ناظر ممبر اسٹیٹ کونسل بہ اتفاق رائے صدر جلسہ منتخب ہوئے ممبران سٹیٹ کونسل اور دیگر افسران بالا کے علاوہ حاضرین کی تعداد پانچ ہزار کے قریب تھی۔ لالہ صاحب کی خدمت میں شعرائے کشمیر کی طرف سے ایک مختصر ایڈریس بھی پیش کیا گیا۔ جس کے پڑھکر سنائے

جانے کا حکم خاکسار کو ہوا۔ آپ نے اس کے شکریہ میں ایک نہایت مدلل اور فصیح تقریر فرمائی۔ جس کے دوران میں آپ نے کشمیریوں کی ذہانت، علمی لیاقت ذکاوت اور حسنِ طبیعت وغیرہ اوصاف کی بیحد تعریف کی۔ مشاعرے کے طرح مصرعے حسبِ ذیل تھے۔ (۱) اب مدعا یہی کہ کوئی مدعا نہ ہو (۲) شمار دانہ تسبیح میں امام نہیں (۳) در نمو و نقشہا بے اختیار افتادہ ام۔ راقم نے بھی دو طرحی غزلیں لکھی تھیں۔ طرح اوّل الذکر میں ذیل کی غزل کہی تھی۔

مجھ کو گلے لگا کے کہا غمزدا نہ ہو — ہاں وعدہ اب یہ کر کہ لبِ شکوہ وا نہ ہو
پہلو میں آکے بیٹھ کہ تو مجھ پہ ہی فدا — آپس میں کچھ حجاب نہ ہو اور حیا نہ ہو
سہنا پڑے تجھے جو ہمارے فراق میں — بہتر ہے اس کا تذکرہ تا اب ذرا نہ ہو
جلنے بھی دے رقیب کی پچھلی شکایتیں — جو آشنا ہو وہ کبھی ناآشنا نہ ہو
یہ شوق یہ وصال یہ لطفِ نیاز و ناز — ممکن نہیں سماں ہو یہ اور غم ربا نہ ہو
یہ سن کے میں نے عرض کی حاضر ہیں حضور — یہ بھی کوئی مذاق کی لیکن ادا نہ ہو
کہنے کی بات گو نہیں لیکن کہوں ضرور — شکوہ نہیں ستم کا مگر ناروا نہ ہو
اک خاص امر پر میں توجہ دلاؤنگا — گو آپ کی نظر میں تو یہ بھی بجا نہ ہو
مدت ہوئی کہ جب یہ سنا تھا حضور سے — تاوان بنالئے غمِ جانگزا نہ ہو
پیغامِ وصل بھیجنگے قاصد کے ہاتھ ہم — آئندہ زینہار زباں پر گلا نہ ہو
ایفائے وعدہ آپنے اب تک نہیں کیا — کچھ اس میں حافظے کی ہی ساری خطا نہ ہو
تکتا رہا پیامی کا رستہ میں مدتوں — ہوں جس سے بدگمان وہ اجی صبا نہ ہو
واللہ فاش بھی نہ کیا رازِ عشق کو — اس واسطے کہ دل بھی کہیں بیوفا نہ ہو

ہوتا ہی تنگ کے جو سبب ہیں آتا ہی نظر خواب | یا شاید اپنے ضبط کی یہ انتہا نہ ہو
بے اختیار ہی یہی آتا زبان پر | اے کاش پھر مغالطۂ دل ربا نہ ہو
یہ سُن کے پہلے بن گئے بت اور لعبتاں | یوں چل دیے کہ جیسے کوئی جانتا نہ ہو
لیکن وہیں جو رہا سا منہ ہائے رہ گیا | اب دیکھیے گا حضرتِ دل کیا ہو گیا نہ ہو

طالب ہمیں زمانے سے لینا نہیں ذرا
اب مدعا یہ ہی کہ کوئی مدعا نہ ہو

۳ر دسمبر ۱۹۱۶ء غیر مطبوعہ

لہ

اف مسیحا خو تری ترک عیادت ہو گئی | ہجر کے بیمار کے حق میں قیامت ہو گئی
راہ چلتے بوسہ لینا اس کا یوں شایاں نہ تھا | کیا کروں محو ہیں مجھ سے حماقت ہو گئی
گالیاں اس شوخ نے دیں مجھکو اور جو تری نصیب | میری تلخی میرے حق میں حلاوت ہو گئی
تاکہ میرا ان کا افسانہ لعنت از بام ہو | چھیڑ خانی سے انھیں آخر ندامت ہو گئی
عشق کا بھرتے رہے دم دم میں دم جب تک رہا | مر گئے حضرت سلامت تو فراغت ہو گئی
گر کیا قتل اس نے مجھ کو غیر کیوں کھاتے ہیں رشک | جس کی تھی تقدیر میں لکھی شہادت ہو گئی

ہاتھ طالب کا جھٹک کر لے کے دامن یہ کہا
چھیڑ خانی کیوں تری کمبخت عادت ہو گئی

۲۹ر دسمبر ۱۹۱۶ء - غیر مطبوعہ

ہو میرے رنج و راحت کا نہ یار راز دا کوئی | نہ سننے پائے محشر میں بھی میری داستاں کوئی
کہو بلبل سے آ کر سیکھ لے طرز فغاں کوئی | کہ آیا ہی عدم سے کہنہ مشق نوحہ خواں کوئی
نہ محتاج مسرت ہوں نہ ممنونِ ترحم ہوں | ذرا بھی مجھ سے پوچھے لذتِ دردِ نہاں کوئی

لہ یہ غزل ہرے گا مقدر [illegible]

یہ دقیانوسی حربے تیرے سارے دیکھے بھالے ہیں
نئی ایجاد کر طرزِ ستم اب آسماں کوئی

میں جس گلشن میں جاتا ہوں بگڑ جاتا ہے رنگ اس کا
کوئی صرصر مجھے کہتا ہے اور بادِ خزاں کوئی

بجائے عیش و عشرت آرزو کرتے ہیں ماتم کی
ہماری ایسی ہستی پر نہ کیوں ہو بدگماں کوئی

ہے لب پر آہ ہر دم اور دل میں سوزشِ پیہم
لگا کر آگ اندر سے اٹھاتا ہے دھواں کوئی

بہت دیکھے نظارے اب تو مر مٹنے کی خواہش ہے
الٰہی حلق پہ میرے کرے خنجر رواں کوئی

بلندی اور گردش کے تو ہم بانی ازل سے تھے
بھلا کیا ہمسری کریگا ہم سے آسماں کوئی

عناصر کے قفس کی تیلیاں اک روز ٹوٹینگی
ابھی سے ڈھونڈ لے ملکِ عدم میں تو مکاں کوئی

مری ہستی رہے قائم نہ طالب دارِ فانی ہیں
نہ عنقا کی طرح جز نام ہو باقی نشاں کوئی

۱۵ مارچ سنہ ۱۹۱۷ء مطبوعہ "شیو شنبھو"

بحرِ ہستی میں حباب آسا کوئی دم بھر گئے
کس کو ہے معلوم آئے کس طرح کیونکر گئے

کچھ پھلا پھولا نہ باغِ دہر میں نخلِ مراد
چند روزہ موسمِ گل تھا کہ ضائع کر گئے

ایک تنکا تک نہ چھوڑا ہستیِ موہوم کا
اس چمن سے آشیاں ہم دوش پہ لیکر گئے

دب گئی بارِ ندامت سے گنہگاری مری
شرم سے تا منزلِ عقبیٰ جھکا کر سر گئے

دفترِ آزادگی میں کام سے اکتا کے آہ!
سوئے تحصیلِ اسیری ہار کر رہبر گئے

یار غصے میں پکارا بزم کو خالی کرو
جلنے سے پہلے مگر ہم جامِ ہستی بھر گئے

تارکِ عقبیٰ ہوئے ہم طالبِ دنیا ہوئے
مرگِ عالم سوز سے پہلے ہی گویا مر گئے

۴ مارچ سنہ ۱۹۱۴ء غیر مطبوعہ

بڑھتے ہیں روز و شب مرے ارماں نئے نئے
آتے ہیں بن کے جان کے خواہاں نئے نئے

واقف ہماری دردِ نہاں سے یہاں ہے کون
کیا ہوں گے ہم غریبوں کے درماں نئے نئے

گردش سے میری بخت کی شمس و قمر پھریں
ہستی سے میری پاؤ گے دوراں نئے نئے

دل ہے ہمارا یا ہے کوئی کارواں سرا
ہر روز آئے رہتے ہیں مہماں نئے نئے

میرے لیے تو خانہ سے بہتر ہے میکدہ
دلبر ہیں اس میں حوریں ہیں غلماں نئے نئے

۱۶ جولائی سنہ ۱۹۱۶ء کو کالج کی بزمِ سخن کا "مشاعرہ زیرِ صدارت مولوی محمد اسحاق صاحب ایم۔ اے۔ ایم او۔ ایل۔ ایچ بی۔ ایچ اے۔ پروفیسر فارسی منعقد ہوا۔ مصرعۂ طرح یہ تھا۔ ع "رہا کردے مجھے صیاد اب فصلِ بہاری ہے۔ میں نے اس طرح میں ذیل کی غزل لکھی تھی۔ پروفیسر صاحب نے اس کو پسند فرمایا۔ بلکہ بحیثیتِ صدر اپنی اسپیچ میں اس کا خاص طور پر ذکر کیا۔

سراپائے غزل عشقِ جہاں سے اپنا عاری ہے۔
زمینِ شعر میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہماری ہے
نہیں اہلِ زباں منہ میں زباں گویا تو رکھتا ہوں
رہوں چپ کس طرح بزمِ سخن میں میری باری ہے
مزا آتا ہے لعنت ہے جوابِ بندگی جب سے
ہماری دفترِ اشعار میں اُس [illegible] داری ہے

بھلایا ناقۂ لیلیٰ کا ذکر خیبر دل سے
کہ آتی خسروِ شیریں سخن کی اب سواری ہو

نہ مجھ سے نبھ سکیگا عشق گیسوئے لف و کاکل کا
نحیف و ناتواں ہیں اور یہ زنجیر بھاری ہے

مجھے اک مصرعۂ رنگیں ہی بہتر قدِ موزوں سے
کہ اپنی نکتۂ بیت الغزل میں خانہ داری ہو

نہ مہرِ مہوشاں سی کر رہا ہوں گرم بازاری
کہ میری دلبرِ اشعار سے اُلفت شعاری ہو

ہوا باندھی ہے بزمِ شعر میں یاروں نے کیا طالب
رہا کرتے ہے مجھے صبا و اب فصلِ بہاری ہے

اس غزل کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۲۹

بہ عزنِ حجاب دمِ شوق ہم ہوئے — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
دامن نہ چھوڑا جوشِ جنوں میں بھی یار کا — 〃 〃 〃 〃
خط میں کیا خطابِ تغافل شعار دوست — 〃 〃 〃 〃
بے اختیار ہو کے دعا مانگتے رہے — 〃 〃 〃 〃
حالت میں نزع کی کفِ افسوس مل لیے — 〃 〃 〃 〃
با جب گلے میں یار کے ہم چھٹے لٹتے رہے — 〃 〃 〃 〃
بچ صنم لکھا کیے جب تک تھی دسترس — 〃 〃 〃 〃

۱۳ اکتوبر ۱۹۲۱ء - غیر مطبوعہ

خوگرِ آفات پا کر سیلِ طوفانی مجھے[۱]
کر گیا ممنونِ سیرِ خانہ ویرانی مجھے

دل کو آتا ہے خیالِ کوچۂ گیسوئے یار
وائے ناکامی ستاتی ہے پریشانی مجھے

خواہشِ سجدہ ہے سنگِ آستانِ یار پر
پھوڑنا سر کا ہے گویا نقشِ پیشانی مجھے

المدد اے ہجومِ اشک ہے وقتِ مدد
پھر جلاتا ہے یہ سوزِ دردِ پنہانی مجھے

دل مرا مصروفِ ضبطِ نالہائے گرم ہے
ہے سناتا داستانِ عشق طولانی مجھے

نالۂ پیچیدہ میں پنہاں تھا وہ بولا
ہے زباں میری سکوت افزا گرانجانی مجھے

اب کہاں ہیں وہ امنگیں اور کہاں وہ ولولے
جو سراسیمہ کرے شوقِ غزلخوانی مجھے

آج میں کرتا رہا کیا عالمِ بالا کی سیر
ہے خیالِ یار اک تختِ سلیمانی مجھے

تھا مرا جوشِ جنوں آمادۂ افشائے راز
رکھتا ہے روپوش لیکن بیمِ عریانی مجھے

حضرت کیفی کی شاگردی پہ نازاں کیوں نہ ہوں[۲]
میں ہوا طالب تو بخشا فیضِ روحانی مجھے

۲۴ دسمبر ۱۹۱۶ء - غیر مطبوعہ

۱ یہ غزل میرے دوست پنڈت سندلال صاحب ہیڈ کلارک ایگریکلچر ڈپارٹمنٹ کو بہت پسند ہے
(طالب)

۲ اس مقطع کو دیکھ کر اُستاد ہمارے نے اپنی طرف سے مندرجۂ ذیل دو شعر تحریر فرمائے تھے۔

شعرگوئی کا کہیں احباب کیوں مانیں مجھے
کر لیے مانیں وہ اُستادِ سخندانی مجھے

شعرگوئی سے غرض کس کو فقط منظور ہے
سادہ لفظوں میں بیانِ دردِ پنہانی مجھے

(طالب)

کبھی جو بھول کر زاہد صنم خانے میں آتا ہے — خدائی کا رخانے دیکھ کر وہ سہم جاتا ہے

عجب ہی جذبۂ دل کیوں ہوں قربان میں اس پر — کہ عاشق کا یہ خضر راہ ہی رستہ دکھاتا ہے

لگا بیٹھیں کہیں اپنا اگر دل حضرت ناصح — تو ہو معلوم ان کو عشق میں کیا سر پہ آتا ہے

جھکاتی ہے کوئی چاہت ہمیں چاہِ زنخداں کی — خدا جانے کہ اس کے بعد طالع کیا دکھاتا ہے

سوا تیرے نہیں اس دل میں تل دھرنے کی جا باقی — ترا ہی دل ہے وہ جس میں جہاں سارا سماتا ہے

بھلا کیا ہاتھ آتا ہے تہی دستانِ قسمت کو — چنار ایک ایک کو دست تہی اپنا دکھاتا ہے

نظر ڈالی جو نرگس پر تو دل میں یہ خیال آیا — یونہی یہ انتظارِ دید مجھ کو بھی ستاتا ہے

جو دل ہو صاف اور شفاف مثل آئینہ طالب
تو یہ خود عکس روئے یار دکھلانے کو آتا ہے

۳ فروری ۱۹۱۷ء مطبوعہ گلشن لاہور

تنہا نہ اپنا عشق سے تن ہی نحیف ہے — درماندگی میں جان بھی اپنی حریف ہے

لطف جفائے یار کا نقشہ نہ کھنچ سکا — کس کام کی ہماری یہ طبع لطیف ہے

اغیار کیا ستائیں گے میرا یہ حال ہے — دل ناتواں ہے جان نزار و ضعیف ہے

نو مشق طفل کا سا نہ کیوں قافیہ ہو تنگ — جس کا کمال شعر میں مشق ردیف ہے

دیکھا جو وقت نزع کہا دیکھا رہا ہے دم — دل بر بہانہ ساز بھی ہے اور ظریف ہے

طالب کو لوگ کہتے ہیں آوارہ و خراب
اور اس پہ طرہ یہ کہ وہ مرد شریف ہے

۷ نومبر ۱۹۱۷ء - غیر مطبوعہ

صنم میرا ہزاروں عاشقوں کا دل کچلتا ہے — ذرا سی بات پر ہوتا خفا ہے اور مچلتا ہے

یہ دھڑکا ہے نہ خم آئے کہیں تلوار میں قاتل
نہیں پروا مجھے اس کی کہ میرا دم نکلتا ہے

مرے خوں رونے پر کہتے ہیں عادت ہے عاشق کی
وہ تھوکے پان کھا کر لعل کہتے ہیں اگلتا ہے

لب جاں بخش سے مجھ کو جلایا جس نے مارا تھا
اسی چشمہ سے سنتے آئے ہیں امرت نکلتا ہے

تو کچھ پروا نہ کر سوز درون عاشق صادق
کہ مرد اس بزم الفت میں مثال شمع جلتا ہے

تماشا دیکھتے ہو دیکھے جگر کا اپنے بسمل کا
ہماری جان جاتی ہے تمہارا دل بہلتا ہے

ملوّن اتنا دل ہے کہ نیرنگی عالم ہے
کہ گرگٹ کی طرح سو رنگ پل بھر میں بدلتا ہے

اگر کامل ہو سوز عشق تو کیا وصل مشکل ہے
حرارت ہو اگر کامل تو لوہا بھی پگھلتا ہے

عجب ہے شاہراہ عشق پرآشوب اے طالب
کہ جو رکھتا قدم اس راستہ میں وہ پھسلتا ہے

۱۴؍ نومبر ۱۹۱۲ء غیر مطبوعہ

مجھ پہ یارب ظلم کیا کیا بے وفا کرتے رہے
شرم آتی ہے کہوں کیا افترا کرتے رہے

یا تو وہ دم بھر کے لیے ہوتے نہ تھے ہم سے جدا
یا ہوئی مدت کہ ملنے سے ابا کرتے رہے

رفعت قصر وصال یار تک پہنچی نہ آہ
شاید اس کی نارسائی کی دعا کرتے رہے

آپ کے شکوے کا کیا تذکرہ اتنا ہے ضرور
اپنی قسمت کی شکایت بارہا کرتے رہے

شربت دیدار کی جا علقم شرب صبر ہم
الٹی قسمت سے مری الٹی دوا کرتے رہے

خون رلوانی رہی غیروں کو میری شکل یاس
ایک قطرہ تم نہ آنکھوں سے جدا کرتے رہے

یار کو اپنا بنا جانا نہ غیروں کو ہے یار
حسرت دل زندگی بھر آپ کیا کرتے رہے

طالب دلبر رہے تو کیا خطا کرتے رہے
عمر بھر یہ ایک حق تھا جو ادا کرتے رہے

سالِ گذشتہ میں میرے دوست پنڈت شمبھوناتھ صاحب ور-بی-اے متعلم-ایل-ایل بی کلاس لا کالج الہ آباد کی طرف سے کئی خطوط متواتر آتے رہے جن کا جواب میں عدیم الفرصت ہونے کے باعث وقت پر نہ دے سکا- اس عدم تاخیر نے ایک مضمون سجھایا- جس کو راقم نے ذیل کی غزل میں پیش کیا اور بطورِ معذرت غزل مذکور ان کو لکھ کر بھیج دی-

بہت بگڑی ہوئی اب کے مری تحریر ہی مجھ سے
جواب خط کے لکھنے میں ہوئی تاخیر ہی مجھ سے

خطا میری نہیں اس میں نہ قاصد کا گلہ کوئی
میں بگڑا بخت سے بگڑی ہوئی تقدیر ہی مجھ سے

کسی کے ناز استغنا میں رازِ آزمائش ہے
یہ مضمون داستانِ عشق کی تفسیر ہی مجھ سے

اُدھر پسلی پھڑک اٹھی ادھر چپ لگ گئی مجھ کو
میں پامالِ تحیر اور وہ دلگیر ہے مجھ سے

زمانے کی اگر گردش نہیں تو یہ پھر کیا ہے
جوانی میں عبث بدظن جو چرخِ پیر ہی مجھ سے

وہ دل میں آہ کرتے ہیں مجھے کیونکر یقیں آئے
لگایا جو اُنھوں نے اُڑ گیا وہ تیر ہی مجھ سے

اُدھر وہ منتظر ہیں طالبِ دیدار کے خط کے
اِدھر حسرتؔ مجھ پر اپنی دامنگیر ہے مجھ سے



مناظرِ قدرت

(۱)

بہارِ کشمیر

اگست ۱۹۱۶ء میں دو تین دن کی چھٹیاں تھیں۔ چند احباب آئے اور شالامار باغ کی سیر کو جانے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ نیاز مند اس سال چند وجوہ سے کافی مدت تک کہیں سیر و تفریح کی غرض سے نہ جا سکا تھا۔ لہٰذا ان کے ہمراہ ہونے پر راضی ہوا۔ چھٹی کے پہلے ہی دن گیارہ بجے صبح سے ایک ڈونگہ (کشمیری ہوس بوٹ) میں سوار ہو کر روانہ ہوئے اور ڈل کا نظارہ دیکھتے ہوئے اوّل نشاط باغ میں داخل ہوئے۔ رات کو یہیں ٹھہرے۔ کھانا پکانے کا انتظام معقول طور پر کیا گیا تھا۔ دوسرے دن دس بجے صبح کھانے پینے سے فراغت پا کر شالامار باغ کی طرف روانہ ہوئے۔ دن بھر بارون اور آس پاس کے خوشنما مقامات کی سیر کی۔ شالامار باغ کی دلکش کیفیت کا مزا کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو اتوار کے دن وہاں جانے کا کبھی اتفاق ہوا ہو۔ کیونکہ اس دن یہاں فوارے چھوٹتے ہیں۔ جا بجی کر یہاں سے قریب چار بجے شام نسیم باغ کی طرف چل پڑے جو

یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ نسیم باغ میں چناروں کی بہار۔ دھوپ میں ان کی چھاؤں سبزے کا مخملی فرش۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں۔ چاروں طرف پہاڑوں کا منظر سامنے ڈل کا نظارہ شام کا سہانا سماں۔ ڈل کے پانی میں شفق کے عکس کا موجزن ہونا ایسی چیزیں ہیں جو بیان سے باہر ہیں۔ جتنے ہمراہی تھے سب اپنے اپنے مذاق کے مطابق مختلف مشاغل میں مصروف ہوئے۔ راقم بھی چہل قدمی کی غرض سے ایک طرف کو ادھر جا کر ڈل کے کنارے بیٹھ گیا۔ قدرت کا منظر خاموشی اور دلربائی میں آنکھوں کے سامنے وہ سین پیش کرتا تھا جس سے خود بخود ایک قسم کی تسکین وہ اور سکونت افزا مسرت کی حالت دل پر طاری ہو جاتی تھی جو کچھ یہاں ذہن میں آیا منتشر اشعار کی صورت میں اسی جگہہ لکھ ڈالا تیسرے دن گھر کو واپس آئے۔ چونکہ ابھی اس سمے کا نقشہ آنکھوں میں پھر رہا تھا اس نظم کو ترتیب دیکر اور نظر ثانی کر کے مکمل کر دیا۔ اس کا ایک ایک شعر ظاہری و باطنی حالت کے خاکہ سے کم نہ سمجھنا چاہیے۔ سات دنوں کے بعد یہ ترکیب بند رسالہ "شیو شمبھو" لاہور اور "بہار کشمیر" لاہور میں طبع ہوا تھا

مدت سے آرزو تھی لطف بہار دیکھوں — کاشانۂ چمن کے نقش و نگار دیکھوں
آبادی جہاں سے منہ موڑ کر چلوں میں — دامانِ کوہ میں اک جائے قرار دیکھوں
چاروں طرف ہو چھایا ہو کا سماں جہاں پر — اور درمیان ڈل کے دل کا قرار دیکھوں
دل کا کنول کھلائے موجِ نسیمِ گلشن — بلبل کی طرح گل کو اس میں نثار دیکھوں
نظارۂ چمن میں جادو کا سا اثر ہو — کہسار ان جنگلوں میں پیدا اپار دیکھوں
باغ نشاط میں ہو دل کو نشاط حاصل — اور نسیم ڈل ہو اور شالامار دیکھوں

کانوں کو میری بھائیں وہ دلربا صدائیں
پیغامِ خامشی پہ مرغانِ باغ لائیں
اس وقت برگِ گل سے درسِ وفا پڑھوں میں
کھل جائے مجھ پہ رازِ ناز و نیازِ الفت
حیرت ہو دور میری نرگس کے درشتوں سے

جب طائروں کی بن میں ہر سو پکار دیکھوں
ہر رنگ میں نمایاں گلبن کا خار دیکھوں
اور جلوہ ہائے پنہاں ہمہ آشکار دیکھوں
بلبل کے سامنے جب گل کا سنگار دیکھوں
مٹ جائیں داغ دل کے جو لالہ زار دیکھوں

دل میں تھا شوق ایسا ٹھہرو ہوا میں رخصت
تھا لطفِ گلستاں کا یا ایک طلسمِ قدرت

تھا محوِ حسنِ قدرت مستِ بہار ہو کر
وحشت تھی دور میری صبر و سکوں تھا حاصل
آبِ رواں کی چادر سبزے نے منہ پہ تانی
چھائی ہوئیں گھٹائیں گھنگھور آسمان پر
سروِ سہی کی شاخیں تھیں جھومتی ہوا سے
کرتا تھا صاف پانی پہلو بدل بدل کر
بدلا تھا رنگ یکسر دنیائے ظاہری کا
محرابِ در کی صورت سنبل کے پیچ و خم تھے
جلوت میں نورِ کثرت تھی عینِ وحدت
تھی یوں بن جراتی سبزی چمن کی گلشن
مطلوب تھے وہ میرے کشمیر کے مناظر
جی میں خیال آیا پہلو کو چیر ڈالوں

ناظورۂ ازل سے یوں ہمکنار ہو کر
مستِ الست گویا تھا رازدار ہو کر
جس طرح سو رہا ہو کوئی نزار ہو کر
برسا رہی تھیں موتی ابرِ بہار ہو کر
یا کوئی لڑکھڑاتا تھا بادہ خوار ہو کر
نقش و نگار ہو کر اور آبشار ہو کر
آئی شمیمِ گل پر بلبل سوار ہو کر
پہرہ لگائے نرگس تھی چوبدار ہو کر
آنکھوں میں آ سمائے اغیار یار ہو کر
جیسے کوئی چھپائے منہ شرمسار ہو کر
عیش و نشاط ہو کر اور شادمار ہو کر
دل میں جو حسرتیں ہیں اک بار وہ نکالوں

ہستی کا اک کرشمہ تب میں تجھے دکھاؤں / اور نیستی کا نقشہ آنکھوں میں خود جماؤں
بادِ صبا بجائے شاخِ شجر سے باجا / میں بیٹھ کر لبِ جو اک راگنی سناؤں
پھر گوشِ ہوش کھولیں یہ رازدارِ گلشن / جی کھول کر میں اپنا سب دردِ دل سناؤں
پھر مردمانِ بینا ڈبکی لگائیں ان میں / آنکھوں سے اپنی میں وہ گنگ و جمن بہاؤں
دھونی رماؤں خاکِ امید و بیم کی میں / من کی گلی میں پھیری جوگی کی میں لگاؤں
پتوں کی سائیں سائیں بہروں کی وہ صدا ہیں / دل کو مرے لبھائیں موہن کے گیت گاؤں
نقشِ دوئی مٹا دوں کثرت سے دل ہٹا دوں / قدرت سمائے مجھ میں قدرت میں میں سماؤں
غافل خودی سے رہ کر اپنا سروپ دیکھوں / وحدانیت کا نقشہ اس ڈھنگ سے جماؤں
خاموش ہو کے نکلیں ارمان میرے دل کے / اور شانِ بیخودی سے نام و نشاں مٹاؤں
ایسی ہو کوک میری پتھر میں ہوک اٹھے / دل مجھ میں گھر بنائے میں دل میں گھر بناؤں
گلشن کے نغمہ پیرا ہوں غرقِ وجد و حیرت / اک نعرہ لے کے دل کا جب میں ملار گاؤں

اک دم مشاہدہ ہو مطلوب طالبوں میں
اک نور ہو سمایا ان سارے قالبوں میں

(۳)

خطاب بہ دل

ماہِ اگست سنہ ۱۹۱۲ء میں کالج سری امرناتھ جی کی یاترا کی چھٹیوں کے لیے
قریب بیس روز تک بند ہوا۔ راقم کو ان چھٹیوں میں بارہ مولہ کی طرف سیر کرنے کا

خیال آیا۔ یہاں کے ایک مشہور مقام گوسائیں ٹینگ کے دیکھنے کا اشتیاق ہوا بارہ مولہ میں بھی ایک مقام نہایت خوشنما اور دلفریب ہے بلکہ ہندؤں کا تیرتھ استھان بھی ہے۔ یہاں رام کنڈ۔ لچھمن کنڈ۔ اور سیتا کنڈ بھی موجود ہیں۔ مقام ندبور جو ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے ایک سنسان باغ کی صورت میں نظر آتا ہے اور ایک عالیشان و بارونق مقام کی یادگار معلوم ہوتا ہے۔ اس کا موثر منظر دیکھ کر راقم کو چوہدری خوشی محمد صاحب ناظر کی مشہور نظم "شمشادِ کشمیر" کا دھیان آیا جس میں انھوں نے ویر باغ واقع سری نگر کا خاکہ کھینچا ہے۔ چونکہ اس مقام نے ایک نظم لکھنے کی تحریک کی۔ انہی کی بحر اور ردیف و قافیے میں ایک ترکیب بند اس دلکش مقام کی تعریف و بیان میں لکھ ڈالا اور بہت عرصے کے بعد رسالہ "طریقت" لاہور کے ایڈیٹر منشی محمد الدین صاحب فوق کے پاس بھیج دیا۔ اُنھوں نے اس کو بہت پسند فرمایا اور رسالہ میں شائع کیا۔

شور و شر سے شہر کے جب دل ہوا کچھ بے قرار
گھر سے نکلا اس کو بہلانے بسوئے کوہسار

موسم سرما میں لیکر اک بغل میں کانگڑی
مدتوں سے سیر کا میں کر رہا تھا انتظار

دیکھا آنکھوں نے قدرت کے منظر کو [illegible]
اس کا فوٹو پیشکش دل کے کیا بے اختیار

یہ مرقع تھا کہ اک مینا تھا اور اس میں ہی
جس کے سایہ سے ہوئی مستی مرے دل پر سوار

کہتے ہیں فرزانے سچ دیوانہ رہتے ہیں بس است
دل نہ مچلا میرا کیا کیا مثل شتر بے مہار

سخت حیراں تھا کہ یہ توسن ہوا قابو کس طرح
منفعل تھا کیوں میں لایا اس کو سوئے مرغزار

کی نصیحت میں نے اس کو اے دل حرماں نصیب
تو یہاں کیوں بن گیا دیوانہ ہو کر ہوشیار

تب دیا تو کی زباں سے دل نے لب کو یہ پیام — اب میں آنے کا نہیں قابو میں تیرے زینہار
پہلے نقشہ کھینچ لوں اس کا میں کلکِ فکر سے — تا کہ وقتِ نزع تک باقی رہے یہ یادگار
اس سرو وا فزا چمن سے گرد ہے باغِ نشاط — خوش گزرتا ہے یہاں ہر شخص کا لیل و نہار
ہے کسی دلبر کے بر سے نسترن غرقِ عرق — سینۂ لالہ کسی کے عشق سے ہے داغدار
ہے کسی کاکل سے شرما کر بنفشہ سرنگوں — کر رہی نرگس ہے حیرت سے کسی کا انتظار
جس طرف پھرتے ہیں آتی ہے صدائیں سیکڑوں — ہے کہیں کوئل کہیں بلبل کہیں قمری و سار
بن کے بن باسی یہاں پھرتے ہیں سارے دیوتا — ہیں پجاری ایسے پاک استھان کے بلبل ہزار
ڈگڈگائے دھیان ہیں گیانی ہیں پرمیشر کے سب — اور ہے ابھیاس کی دھونی میں استادہ چنار

شہ رگ سے واپس نکل جانا یہ کیا انصاف ہے
حضرت من میری جانب سے جواب صاف ہے

رہ کے دنیا میں فلک پر آشیاں رکھتے ہیں ہم — گرچہ فانی ہیں حیاتِ جاوداں رکھتے ہیں ہم
ہے لبالب ساغرِ دل لب نہیں کھلتا کہیں — ہو نہیں سکتا عیاں جو کچھ نہاں رکھتے ہیں ہم
ہر قدم پر دور آتے ہیں نظر مثلِ شفق — ہے پہنچ سے جو پرے اس جا مکاں رکھتے ہیں ہم
طالبِ سودائے الفت کیوں نہ سودائی ہوا — عشق کے بازار میں کیا کچھ زیاں رکھتے ہیں ہم
غرقِ بحرِ کبر و نخوت آشنا ہوتا نہیں — بے وفائی کا نہ دل تجھ سے گماں رکھتے ہیں ہم
اے مرے پہلو نشین دشمن نہ کر اتنا غرور — واسطے سجدہ کے تیرا آستاں رکھتے ہیں ہم
چل ہمارے ساتھ دکھلائیں تجھے اک سبز باغ — جائے راحت خواہش شور و فغاں رکھتے ہیں ہم
رہ کے پستی میں ہمارا ہے ستارا اوج پر — پا میں ہیں پر زیرِ پا ہفت آسماں رکھتے ہیں ہم
رفعتِ شانِ حقیقت اک شبِ معراج ہے — عقلِ انساں نارسا ہے گھر جہاں رکھتے ہیں ہم

منہ دکھا سکتے نہیں ہیں ہم عریانی سے ہائے — گو پہننے کو لباسِ پرنیاں رکھتے ہیں ہم
بحرِ عالم میں کنارِ عافیت ہے ناپدید — ولے ناکامی نگاہِ ناتواں رکھتے ہیں ہم
عالمِ عقبیٰ میں لینگے اپنی رہنی راہ سب — منزلِ دنیا میں شکلِ کارواں رکھتے ہیں ہم
تن بدن سب ہو چکا ہے نذرِ غم اے ہما — تیری مہمانی کو مشتِ استخواں رکھتے ہیں ہم
بھاگ اٹھنا اے دلِ ناداں نہ مشکل ہے اب — جبکہ سر میں آنکھ کے دو پاسباں رکھتے ہیں ہم
تاب و یارا ہے اگر سننے کا گوشِ ہوش کھول — تیرے بہلانے کو طرفہ داستاں رکھتے ہیں ہم

الغرض با ایں سخن دل را تسلی ساختیم
"ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم"

عالمِ پستی میں ادنیٰ ہو کے تم اعلیٰ رہو — حلقۂ درگوشی میں بن کر ماہ کا ہالا رہو
منزلِ ہستی میں قیدِ زندگی کا ہے ضرر — موتیوں کا دل جگر چھید کر بھی تم جھالا رہو
صاف کہہ دو سوزِ الفت میں کہاں ہے سخن — تم لبِ گویا پہ بن کر مثلِ تبخالا رہو
کرسیِ جلوت میں بھی خلوت میں تم ہو جا نشیں — یعنی ہر حلقہ میں ہر محفل میں تم بالا رہو
دشتِ پیمائی میں قیسِ عامری کے ہو رفیق — کان میں لیلیٰ کے مثلِ لولوئے لالا رہو
گل میں مثلِ بو رہو دل میں رہو مثلِ سرور — برہمن کے ہاتھ سمرن شیخ کی مالا رہو
وقتِ تسلیم و رضا بن جاؤ تم تحت الثریٰ — سربلندی میں تم اوجِ عالمِ بالا رہو
مات ہو بلبل جو بولو اور وقتِ خامشی — ہر سرِ گنجِ معانی ہو کے تم تالا رہو
زینتِ حسنِ چمن کے بعد باغِ دہر میں — خود نہالِ عافیت کے حافظِ اعلیٰ رہو
عاقبت کی عافیت منظور ہے تو بن کے تم — نفسِ سرکش کے لیے تلوار اور بھالا رہو
لطف ہو آرام کا بھی کثرتِ آلام میں — دشتِ پیمائی میں سوزِ عشق کا چھالا رہو

صدقہ ہونے کی کسی کے رُخ پہ خواہش ہو اگر
گر رسائی چاہتے ہو کوچۂ دلدار تک
ہمت و جرأت میں ہو تم پیکر آہن سے سخت
الغرض مطلب کی کہتا ہوں سنو گر ہوش ہے

کان میں اس ماہرو کے بن کے تم بالا رہو
صورتِ آہ و فغاں بن کر ہونا لا رہو
سردی کا نرمی و گرمی میں بنے گا لا رہو
عالم اعلیٰ میں ادنیٰ۔ ادنیٰ میں اعلیٰ رہو

بعد ازیں یاراں چہ گویم حال چون و چند شد
حرف ہائے دل چو بشنیدم زبانم بند شد

(۳)

ارمغان طالب

جناب چودھری خوشی محمد صاحب ناظرؔ کی نظم موسومہ بہ ارمغانِ ناظر پر مخزن ماہ اپریل ۱۹۱۵ء میں ایک تضمین بعنوان قند مکرر نظر سے گزری حضرتِ ناظر کو سری نگر سے مدتِ مدید کی جدائی نے یہ نظم لکھنے پر مجبور کیا تھا۔ اگرچہ راقم کے لیے کوئی ایسی وجہ اس تضمین کے لیے نہ تھی۔ لیکن کشمیر کے مناظر کا سماں اس بات کا مقتضی ہوا کہ اس زمین کو اپنی ناقص طبیعت کا جولانگاہ بناؤں۔ تاکہ کم از کم تصور میں ایسی حالت کا خاکہ پیشِ نظر ہو۔ اس مخمس کا پہلا، دوسرا اور پانچواں مصرعہ راقم کا اور تیسرا اور چوتھا چودھری صاحب کا ہے۔ یہ مخمس ۵ مارچ ۱۹۱۵ء کو لکھا گیا تھا۔

چل ہمیرے ساتھ ان کو دلِ بیقرار دیکھیں
اے ساربان اُٹھائے کب تو مہار دیکھیں

جائیں گلی میں اس کی دیدار یار دیکھیں
ہم ہجر کے ستائے پھر کوئے یار دیکھیں

اللہ جو دکھائے بے اختیار دیکھیں

شکل بہت میں ہم نے دریائے گنگ دیکھا ۔ پریاگ کا تماشا جمنا کا رنگ دیکھا
یہ دشتِ سنگ دیکھا اور کرب تھنگ دیکھا ۔ پھر لالہ زار دیکھیں اور شالامار دیکھیں

باغِ نشاط سے پھر ڈل کی بہار دیکھیں

منظر دیکھنا تھا سو پا گئی ہیں آنکھیں ۔ قدرت کے کیا مناظر دکھلا گئی ہیں آنکھیں
پتھر کے دیکھنے سے پتھرا گئیں ہیں آنکھیں ۔ اب آبشار دیکھیں اور سبزہ زار دیکھیں

دامانِ دشت دیکھا اب کوہسار دیکھیں

ہوتی ہی جان اپنی قربانِ دلربائی ۔ قد سے ہوئی دوبالا ہی شانِ دلربائی
وہ ساعدِ بلوریں وہ جانِ دلربائی ۔ برگِ چنار دیکھیں یا دستِ یار دیکھیں

دو آنکھوں سے الٰہی کیا کیا بہار دیکھیں

آئینگے جب نظر میں نیرنگِ حسنِ یزداں ۔ کھو دیں گے اپنی رنگت یاقوت و لعل رماں
طاس زمرّدیں میں الماس ہوں پریشاں ۔ پتوں پہ ڈل کے موتی جب آبدار دیکھیں

تختِ زمرّدیں پر دُرِّ شاہوار دیکھیں

اک نور ہو برستا گلشن میں برگ د بر سے ۔ فصلِ خزاں کا کھٹکا ہو دور ہر شجر سے
وہ راگ کی گھٹا سی صحنِ چمن سے برسے ۔ ہر رود چنار ملکر گاتے ملار دیکھیں

ہر شاخِ گل پہ گاتے بلبل ہزار دیکھیں

محفل میں بیٹھ کر پھر لطفِ سخن ہو پیدا ۔ بلبل ہو باغ میں پھر اک بار گل کی شیدا
باغِ نشاط میں ہو بزمِ نشاط برپا ۔ ہر سمت چارپاری زیرِ چنار دیکھیں

ملتے ملاتے باہم سب بار بار دیکھیں

ہوں ہمکنار ساتھی احباب پیارے پیارے
حسنِ ازل کے مخزن بیٹھے ہوں پاس سارے
وہ حسن کے نظارے وہ عشق کے نظارے
وہ برقرار دیکھیں یہ بےقرار دیکھیں
وہ تاجدار آئیں ہم خاکسار دیکھیں

اکسیر سے ہی بڑھ کر مٹی ہمیں وطن کی
ہے آرزو یہ من کی ہو سیر اس چمن کی
اشہار ہوں لبن کی اقطار یاسمن کی
بو باس ہو چمن کی گر گشت زار دیکھیں
خوشبو ہو زعفراں کی گر سبزہ زار دیکھیں

گرتا ہو پتھروں پر پانی مچل مچل کر
رکھتی قدم ہو بارش اپنا سنبھل سنبھل کر
چاندی اچھالتی ہوں نہریں اچھل اچھل کر
شاخ و شجر سے ان پر زر کا نثار دیکھیں
چشمے طرح طرح کے اور آبشار دیکھیں

آنکھیں ہوں عاشقوں کی وہ عینِ آبِ حیواں
نظارۂ چمن ہو پھر رشکِ باغِ رضواں
دریا کنارا نزدیک جنگل کی سبز بیاباں
اور کالے دیو بن کر سب دیودار دیکھیں
ہر نوکِ خار گلشن اک پہرہ دار دیکھیں

چھپ چھپ کے چلتے جائیں ہم تختۂ سمن میں
سبزے پہ لوٹتے ہو دل گلشن میں یا ہو بن میں
ہر گل کے پیرہن میں نسرین و نسترن میں
ریحاں میں یاسمن میں تصویرِ یار دیکھیں
ہر رنگ میں نمایاں حسنِ نگار دیکھیں

نورِ خدا ہو ظاہر سمائے ہر بشر میں
آئے اسی کا نقشہ دیکھیں جہاں نظر میں
القصہ خشک و تر میں ہر سنگ میں حجر میں
ہر برگ میں شجر میں حسنِ نگار دیکھیں
اک آئینے میں ظاہر صدہا بہار دیکھیں

بیتاب ہو رہا ہوں منزل ہے دور ناظر
تن تھک کے ہو گیا ہے سب چور چور ناظر

وہ نور جلوے کی چوٹی ہو اپنا طور نا نظر	سرکار کی تجلی وہ آشکار دیکھیں
	موسیٰ کی طرح ہم بھی دیدار یار دیکھیں
مایوس کیوں ہو طالب دل کو نہ کر تکدر	مطلوب خود ملیگا قسمت اگر ہو یاور
وقتِ قبولیت ہے اللہ سے دعا کر	کشمیر کی بہاروں میں کردگار دیکھیں
	یعنی کہ اپنے جذبِ دل کی بہار دیکھیں

(۴)

اہرل کی سیر

اہرل کشمیر میں ایک نہایت پُر فضا اور قابلِ دید مقام ہے۔ راقم کو بھی اس کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ سری امرناتھ سوامی کی یاترا کی چھٹیوں میں، اگست ۱۹۱۹ء کو چند احباب کے ساتھ اس طرف کو روانہ ہوا۔ سری نگر سے یہاں تک تقریباً ۴۰ میل کا فاصلہ ہے۔ اوّل قصبۂ نسو بیاں میں تین روز تک ایک دوست کے اصرار پر اُن کے ہاں ٹھہرے۔ چوتھے دن علی الصباح اس کا نظارہ دیکھنے گئے ہمراہیوں نے خورد و نوش اور دیگر ضروریات کا کافی انتظام کیا تھا۔ ایک دو نوکر بھی ساتھ تھے جنھوں نے ہر قسم کی سہولت کا سامان مہیا کر رکھا تھا۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی ہم منزلِ مقصود پر پہنچے۔ اس جگہ پانی پہاڑ سے تقریباً بیس فٹ کی بلندی سے ایک آبشار کی صورت میں نہایت زور و شور سے گرتا ہے جس سے سیاحوں کو کچھ تو مسرت حاصل ہوتی ہے اور کچھ دل پر وحشت چھا جاتی ہے ہر طرف سناٹے کا عالم نظر آتا ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ مقام ایک تارک الدنیا کے لیے

موزوں ہی یا ایک سچے طالب دیدار کے حصولِ مطلب کے شایانِ شان ہو عام لوگوں کا یہاں دخل نہیں۔ کوئی بشر ایسا نہ ہوگا۔ جو یہاں اپنے تمام راحت و آرام اور رنج و آلام نہ بھول جاتا ہو۔ اِس آبشار کو دیکھ کر راقم کے دل میں کیا کیا خیالات موجزن ہوئے۔ ایک مختصر ترکیب بند موسوم بہ "آبشار اوربیں" کی صورت میں مندرجۂ ذیل نظم کے بعد درج ہیں اور یہاں کے آس پاس رہنے والے گجر لوگوں کی سیدھی سادی مگر قابلِ رشک زندگی نے کیا کچھ سمجھایا۔ ذیل کے ترکیب بند سے معلوم ہوگا۔

دل میں تھی حسرت کہ دیکھوں آبشاروں کی بہار
سبزہ و گل کا نظارہ جوئباروں کی بہار
مرکزِ داغِ ملالِ یاس و حرماں تھا بنا
دیکھ کر میں اپنے دل کے لالہ زاروں کی بہار
بسکہ دِل اُکتا گیا تھا شور و شر سے شہر کے
بزمِ یاراں میں نہ تھی مرغوب یاروں کی بہار
آرزو تھی دیکھتا ہیں گلشنِ مہر و وفا
راستی اور صدق کے امیدواروں کی بہار
جس جگہ ثابت قدم ہوں شاہدانِ بزمِ حُسن
رنگ لاتی میرے دل کے انتشاروں کی بہار
گوش شنوا چشم بینا بن کے دنیا دیکھتے
سازِ وحدت پر حقیقت کے ہوتاروں کی بہار

چشمۂ چشمِ خمار آلودہ میں آئے نظر
عکسِ ہستی اور قدرت کے نظاروں کی بہار

دور ہو شاید یونہی بارِ غم و اندوہِ دل
چشمِ نظارہ میں کھنچ جائے بہاروں کی بہار

ضبط ناممکن ہوا جوشِ جنوں بڑھتا گیا
ٹھان لی آخر کہ دیکھوں کوہساروں کی بہار

عالمِ وحشت میں آخر چل پڑا میں شہر سے
ہو عیاں قدرت کے جس جا پردہ داروں کی بہار

بود چوں نابود از مدت ہزار آرزو
خواستم شاداب میدیدم بہارِ آرزو

تھا ابھی مشکل سے نکلا عالم افروز آفتاب
منزلِ مقصود میں جب ہو گیا میں باریاب

ڈال دی میں نے پہنچتے ہی نظر چاروں طرف
دیکھ لیں نیرنگیاں قدرت کی تحسین لاجواب

ابر بدمستی سے گھوڑوں پر ہوا کے تھا سوار
پی کے آیا تھا شمیم ساغرِ گل کی شراب

نورِ سبحانی نمایاں تھا وہاں ہر ذرہ سے
قابلِ نظارہ تھی وہ اہربل کی آب و تاب

نغمۂ رحمت بجاتی تھی جو مضرابِ نسیم
سازِ ہستی کی صدا تھی نغمہ پردازِ رباب

سینہ میں بانسوں اُچھلتا دیکھ کر دل وہ سماں
جس کی دل آویزیاں تھیں کل جہاں میں انتخاب

چشمِ بینا کے لیے تھا دفترِ معنی کھلا
شاہدِ حسنِ ازل کا جلوہ تھا بے حجاب

اپنے آپے کی رہی سُدھ بُدھ نہ مجھکو اس جگہ
خود فراموشی کے دریا میں تھا مانندِ حباب

گاؤں کا وہ دلربا منظر غذائے روح تھا
لطفِ نظارہ وہ جس کا تھا نہ کچھ حد و حساب

العرض منظر تھے قدرت کے نمایاں ہر طرف / جن کے آئینے میں اُترا نقشِ حسنِ لاجواب

اہلِ دہ را شادماں دیدم مقیم اھر جل
پیش ایشاں رفتم و گفتم بہ آں اہلِ جبل

دوستو تم کو مبارک ہو یہ دلکش سرزمیں / شکرِ حق میں ختم کرو تم رات دن اپنی جبیں
بن کے باسی بن کے بیٹھے کنجِ تنہائی میں تم / فکر سے آزاد ہے شہرِ کہستاں کے مکیں
آشنائی تم کو دکھ سکھ کے نہیں احساس سے / شاد و شادی میں نہیں غم میں نہ ہو اندوہگیں
بھول کر بیٹھے ہو تم رسم و رہِ دنیوی / کر چکے ہو دور ہیں بے غرضی تم از پردہ نشیں
ہو الگ بیٹھے ہوئے تم شہر کے جنجال سے / پرشکستہ اور صحت ہوا سے تم ذرا واقف نہیں
سادگی پر ہیں تمہاری سینکڑوں فیشن نثار / خرمی ہے فضلِ حق - حق ہیں تمہارے بالیقیں
کرتے ہو دن زندگی کے عیش و عشرت میں بسر / واسطہ رکھتے ہیں تم سے ذرا بھی بغض و کیں
ہو نہ پابندِ علائق شہر والوں کی طرح / اختلاطِ باہمی سے تم ہو بالاتر کہیں
بے خبر ہو دردِ کاوشہائے بے مہری سے تم / گو تمہیں گھیرے ہوئے ہر دم ہیں قدرت کے حسیں
قابلِ صد رشک ہے بیشک تمہاری زندگی / گرچہ تم کو علم ایسی بات کا مطلق نہیں

چوں سخن را ختم کردم مشتدر و حیراں شدند
ہم سخن ایں طور با من جملہ آں ایراں شدند

ہمدمو! ہیں نگہائے فخرِ انسانی ہو تم / سچ اگر پوچھو تو زیبِ عالمِ فانی ہو تم
شہر میں ہیں صاف سڑکیں کالج اور اسکول ہیں / گامزن جن سے سوئے معراجِ روحانی ہو تم
مشعلِ علم و ہنر سے کرتے تاریکی ہو دور / بزم میں اہلِ نظر کی شمعِ نورانی ہو تم
محفلیں ہر صحبتیں ہیں عیش کے ساماں ہیں / آیتِ لطفِ مخیرِ دو شانِ یزدانی ہو تم

عشق میں پاتے ہو تم ہی لذتِ سوز و گداز — حسن کے پردے میں وقفِ نور افشانی ہو تم
صنعت و حرفت کے ساماں ہیں مہیا شہر میں — مثلِ نقاشِ ازل بہزاد ہو مانی ہو تم
تم میں بسوامتر و کالیداس آتے ہیں نکل — ہو غنی توصیف سے تم فخرِ خاقانی ہو تم
شان سے کرتے ہو تم اپنے مکاں آراستہ — خانہ آرائی میں کیا بے مثل و لاثانی ہو تم
منبعِ الطاف ہو سرچشمۂ جود و کرم — شہر والو علم اور تہذیب کے بانی ہو تم
ہر طرح مسرور و خرم شاد ہو دلشاد ہو — بے خبر ہر شی سے ہم محبوبِ سبحانی ہو تم

چوں سخنہائیش بدیں صورت سرانجام یافت
موقعِ اظہارِ حالت ایں دلِ ناکام یافت

ہنستے اور بستے رہو ای میرے یارانِ چمن — صبحدم تم کو مبارک ساز و سامانِ چمن
لوٹتے رہنا عنادل کے ہو نغموں کی بہار — ہیں سناتے راگنی جب خوشنوایانِ چمن
حجلۂ گلبن سے بن ٹھن کے نکل آتے ہیں جب — رنگ دکھلاتے ہیں کیا کیا نو عروسانِ چمن
آہ ای باشندگانِ عالمِ صبر و سکون — جانفزا ہیں کس قدر سبز رنگِ دامانِ چمن
وہ سکونِ قلب جو شاہی نہ شاہوں کو نصیب — محو ہیں جس میں تمہارے نغمہ سنجانِ چمن
مست جامِ بیخودی ہو دامنِ کہسار میں — ہے تمھیں حاصل بہارِ سبز پوشانِ چمن
کاش میری زندگانی یونہی ہوتی بسر — کاش رہتا کچھ دنوں ہی میں بھی مہمانِ چمن
قلق ہی آ گئی سر پر جدائی کی گھڑی — دل کے دل ہی میں رہے جاتے ہیں ارمانِ چمن
سیر اس گلزار کی افسوس جی بھر کر نہ کی — ہیں لیے جاتا ہوں دل میں داغِ ہجرانِ چمن
رخصت ای یاراں کہ پہنچا زمانِ الوداع — الوداع اب الوداع ای دوستدارانِ چمن

چوں پس مردن دوبارہ زندگی یابیم ما
طالب آں منزل دہقاں از خدا باشیم ما

(۵)

آبشار اور میں

آ آبشار ہم کریں ایک جا قرار
آ میرے پاس دونوں ہوں آپس میں ہمکنار

تو مجھ کو اور میں تجھ کو سنائیں درد دل
حالت پہ ایک دوسرے کی روئیں زار زار

تو گر رہی ہے گر تو کسی کے فراق میں
ہوں گر رہی کسی کی مجھے یاد بے قرار

آئی ہے تنگ تو جو زمانے کے ہاتھ سے
آ جا جگاہ غم ہوں میں آشفتہ روزگار

دست سے دور بھاگ مرے پاس سے نہ تو
دست جنوں ہی بیچ ہے گریباں ہے تار تار

نئی ہیں ہیچ و قیمتیں ہر گام پر مجھے
تو ٹھوکروں پہ ٹھوکریں کھاتی ہے بے شمار

بخت ہے تو اور ہوں حرماں نصیب میں
تو خستہ حال ہے تو ہوں میں بھی ذلیل و خوار

تو میری راز داں ہے ہوں تیرا راز داں
شرمندہ میں نہ تجھ سے نہ تو مجھ سے شرمسار

اک حال میں ہیں دونوں ستم دیدہ ہیں بہت
غمخوار ہو تو میری میں ہوں تیرا غمگسار

شبنم سے پینے جلد لگا مجھ کو تو کہیں
ہے بغیر یار کوئی آشنا نہیں

شکوہ ہے تجھ کو فرقت یار و دیار کا
دلدادہ میں کسی کے ہوں روئے نگار کا

سر پر ہوا ہے بار کسی سنگدل کا عشق
ہم رنگ و ہمنوا ہوں میں تجھ زہر بار کا

قابو نہیں ہے اب مجھے اپنے آپ پر
خاک اُڑا رہی میرے بھی صبر و قرار کا

بیزار ہوں وطن سے میں بستی سے تو ہے دور
پابند تو نشیب و فراز زمانہ کی
آتی نہیں ہے خوش تجھے رنگینیٔ چمن
مایوسی ہے اگر تجھے دیدار یار سے
ہمدم ہے میری اس لیے تو رہ نہ مجھ سے دور
مستی کا تیری رنگ بھی گہرا ہے اس قدر

مسکن بنا ہیں دونوں کسی کوہسار کا
میں ہوں شکار گردشِ لیل و نہار کا
عاشق نہیں میں شورشِ وصلِ بہار کا
میں کشتۂ ادا ہوں کسی گلعذار کا
کچھ پاس ہے گر ایک غریب الدیار کا
جتنا دگرگوں حال ہے مجھ بادہ خوار کا

نالاں ہوں رات دن میں تو ہے اشکبار تو
گریاں صبح و شام میں تو بے قرار تو

رونے سے میرے روئے زمیں سب پر آب ہے
جائے شگوفہ شاخِ چمن پر حباب ہے
وہ اشک ریزیاں ہیں تری اپنے حال پر
حسرت سے کہ بادلوں کا بھی دل آب آب ہے
میں مبتلائے ہجر تو آوارۂ بلا
محبوس میں تو مائلِ صد پیچ و تاب ہے
بے اختیار میں ہوں تو ہے تو بھی بیقرار
بیتاب وار میں ہوں تجھے اضطراب ہے
میرے لیے زمانہ میں زندان و بام ہے
تو بھی اسی نمائش سے حسرت مآب ہے

ہستی مری اِک آمد و رفتِ حیات ہے
تیرا وجود بھی تو مدوجزرِ آب ہے
گویا غبار بن کے اڑی تو ہوا میں خاک
دونوں کی ایک طرح سے مٹی خراب ہے
بیکس ہے تو ہیں لوگ تجھے شاد دیکھ کر
بے بس ہوں مجھ کو دیکھ کے خوش شیخ و شاب ہے
پھر مجھ سے تو جدا ہو رہوں تجھ سے میں جدا
افسوس اے دریغ عجب انقلاب ہے

بیماری فراق کشیدم چہ شد ترا
ناآشنا بمرگ رسیدم بہ شد ترا

بچپن کی یاد

مخمس بروزن سرور

آج سے تقریباً نو سال پہلے اپنے ایک دوست پنڈت رانبہ صاحب
منشی گبرانی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پنڈت صاحب مرحوم اخلاق اور اوصاف

حمیدہ کی ایک مجسم تصویر ہونے کے علاوہ انگریزی اور اُردو لٹریچر کے دلدادہ تھے چنانچہ باوجود محدود تعلیم پانے کے اُنھوں نے دونوں زبانوں کے بڑے بڑے مصنفوں اور شاعروں کی بیشتر تصانیف اور دواوین کا مطالعہ کیا ہوا تھا جب کبھی راقم ان کے ہاں جاتا تھا یا وہ نیازمند کے مکان پر تشریف لاتے تھے اکثر اُردو۔ فارسی شعر و سخن کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اِس روز جس کا اوپر ذکر ہوا اُنھوں نے مرحوم منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی کے کلام کی دو کتابیں "خمخانہ سرور" اور "جام سرور" لاکر میرے سامنے رکھدیں اور فرمایا کہ حال کے ایک نوجوان شاعر کا کلام دیکھئے کس قدر پرجوش اور زوردار ہے اور دردو حسا سے بھرا ہوا ہے میں نے کہا جی ہاں! ان کا کلام ملک کے اکثر رسالوں میں وقتاً فوقتاً میری نظر سے بھی گذرا ہے۔ لیکن اس مجموعے کی صورت میں آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اچھا آپ اس میں سے کوئی اچھی نظم پڑھ کر سنائیے۔ کہنے لگے میں تو اس میں سب ہی کچھ اچھا سمجھتا ہوں۔ کہیں سے بھی پڑھ لیجئے بہا ہی لطف ملیگا اتنا کہکر "جام سرور" کو کھولا۔ اور فرمایا۔ مثلاً یہ لیجیے "بچپن کی یاد" یہ کیا دلکش نظم لکھی ہے۔ طفلانہ جذبات کا کیا سچا فوٹو کھینچکر پیش کیا ہے۔ کاش ہمارے ملک کے نوجوان شعراء کے کلام میں بھی اصلیت اور واقعیت کا یہ رنگ پایا جاتا میں نے عرض کی اس کو پڑھ کر سنائیے۔ اول تو نظم کی دلفریبی کا کیا کہنا اور اس پر ان کے دلکش انداز میں پڑھ کر سنانے نے مجھے تھوڑی دیر کے لیے محو کر دیا۔ بے اختیار میری زبان سے واہ وا اور مرحبا کے کلمے نکلے۔ پھر کہنے لگے۔ آپ بھی ایسا ہی ایک خمس لکھئے لیکن شرط یہ ہے کہ صرف تخیل سے کام لیجئے باقی

مضمون۔ بحر وزن۔ قافیہ۔ ردیف وغیرہ یہی رہنے دیجئے۔ کیونکہ یہ بندش اور طرز مجھے دل سے پسند ہے۔ چونکہ راقم بھی اس نظم سے متاثر ہوا تھا۔ ان کے ارشاد کی تعمیل کی اور ذیل کا مخمس لکھکر پیش کیا۔ اس کو پڑھ کر نہایت محظوظ ہوئے اور اسی وقت اس کی ایک نقل لے گئے۔ تین چار سال کے بعد لالہ رگھوناتھ سہلئے صاحب ہیڈ ماسٹر دیال سنگھ ہائی اسکول۔ ایڈیٹر رسالہ "رفیق التعلیم" لاہور کے طلب کرنے پر ان کے پاس اس کو بھیجدیا۔ اُنھوں نے پسند فرما کر اس کو اپنے رسالہ میں شائع کیا۔

خواہش ہے تجھ سے ہوں پھر میں ہمکنار بچپن
تجھ کو گلے لگا کر ہوں اشکبار بچپن
تیرے فراق سے ہے سینہ فگار بچپن
ہاں خواب میں دکھا دے منہ ایکبار بچپن
کب تک سہوں یہ صدمے یہ انتشار بچپن

دل سے غم جدائی اک بار میں نکالوں
ہے آرزو یہ میری پھر تجھ کو دیکھوں بھالوں
بے فکر کھیل کھیلوں گادم۔ بٹیر پالوں
سیٹی بجا کر ان کو جب چاہے دا بُلالوں
اے پیارے عہد طفلی اے غمگسار بچپن

اے کاش پھر وہ آئے جو وقت عمر دا تھا
جب خوف سرزنش بھی اک لطف مرحبا تھا
تھا نفع کا نہ سودا نقصان نہ سوجھتا تھا
مرنا تھا یا نہ تھا جینا سب مجھ کو ایک سا تھا
کیا بے بہا تھی نعمت اے کردگار بچپن

تھی ساتھیوں کی رونق پیشاخ گلشن
رہنا تھا اپنے وادی گلزار و کوئے و برزن
تھے در بدر ہم مانند گرد و ارشن
افسوس پھر نہ ہونگے کیا ان دنوں کے درشن

میرے لیے تھا اک تصویر یا بچپن

بہلانے کے لیے تھے صبح و مسا کھلونے — وہ خوشنما کھلونے وہ دلربا کھلونے
کھو بیٹھا ہائے اپنے میں غمزدہ کھلونے — ظالم تھا کون میرے جو لے گیا کھلونے

اس کا ہوں منتظر میں دیوانہ وار بچپن

ماں باپ کا اپنے میں پیارا لاڈلا تھا — تھا دھن کا اپنی پکا گویا کہ بادشا تھا
حاسد نہ تھا کسی کا رنجش سے بھاگتا تھا — یکساں میں نیک و بد کو اس وقت جانتا تھا

اک تجھ کو جانتا تھا میں غمگسار بچپن

وہ ساتھیوں کا میرے آگے سے ہونا اوجھل — ان کی تلاش میں پھرنا وہ دھوپ پیدل
وہ کھیل اور وہ چہلیں وہ باغ اور وہ جنگل — تھک تھاک کے گھر کو واپس آنا وہ بے کل

دل میں ابھی ہے باقی وہ یادگار بچپن

خطرہ ہو گرچہ بھاری ممکن نہ تھا جھجکنا — وہ جھوٹ اور سچ پر رکنا نہ اور اٹکنا
وہ پیڑ کی سواری وہ شاخ سے لٹکنا — وہ راہ بھول جانا اور ہر طرف بھٹکنا

تیری عنایتوں کا کیا ہے شمار بچپن

نفع و ضرر پہ ہر دم انجان مسکرانا — اور ساتھیوں کا ہنسنا اور میرا منہ چڑانا
بزم خوشی میں گاہے روٹھے کا وہ منانا — عیش و طرب کے نعرے چاروں طرف لگانا

کیا کیا سناؤں تجھ کو ہوں بیقرار بچپن

ہر بات پر بگڑنا ہر چیز پر مچلنا — گر بیٹھنا اچھلنا اور کودنا جو چلنا
الٹے پٹے کا پہلو ہر کام میں نکلنا — جو منہ سے کہہ دیا بس اس کا [illegible]

اے بادشاہ بچپن اے طرفہ کار بچپن

او نا سمجھ فسونگر او دل لبھانے والے
دل میں لگن لگا کر دل کو جلانے والے
پھر کر ذرا نظر کر او منہ چھپانے والے
مڑ کر ذرا ادھر کر او تیز جانے والے
پیچھے ترے رواں ہوں بے اختیار بچپن

شام شفق وہی ہے نورِ سحر وہی ہے
ہے تابِ شمس ویسی آبِ قمر وہی ہے
جس طرز پر کبھی تھا یہ بحر و بر وہی ہے
دنیا میں امن و راحت اور شور و شر وہی ہے
اب کیا ہوئے وہ تیرے نقش و نگار بچپن

غائب ہوا ہے بچپن کیونکر تو ناگہانی
تف ایسے جینے پر ہو کیا لطفِ زندگانی
ہوگا نہ ارغوانی یہ رنگِ زعفرانی
بیہودہ اب ہے بیلے امیدِ شادمانی
آہستہ چل خدارا اے تیز کار بچپن

تقدیر میں جدائی لکھی تھی وائے حسرت
بچپن نہ تجھ کو کرتا دنیا کے بدلے رخصت
جاہ و جلال تیرا باقی نہ تیری عظمت
کھو بیٹھا تجھ کو اک دم آہ وائے میری قسمت
روتا ہوں تیری دھن میں کیا زار زار بچپن

جب تو تھا میرا ساتھی چاہت نہ تھی جہاں کی
دیوانگی کی خواہش یا عقلِ نکتہ داں کی
الفت نہ تھی بتوں کی خواہش نہ برگِ پاں کی
بالطبع تھی جو عادت تھی جو ادا سو بانکی
جب تو گیا تو آئے کیونکر قرار بچپن

اس عہدِ بیخودی پر ماتم میں کر رہا ہوں
اس عقل اور سمجھ سے بیزار ہو گیا ہوں
نالوں میں بلبلوں کا طالب ہیں ہمنوا ہوں
مثلِ سرور ہر دم کرتا یہی دعا ہوں
لے لے شباب مجھ سے دے پروردگار بچپن

(۷)

طفلانہ جذبات

اپریل ۱۹۱۶ء میں منشی ونایک پرشاد صاحب طالب بنارسی مرحوم کی ایک نظم راقم کی نظر سے گذری۔ جس میں ایک ایسے لڑکے کے جذبات کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جس کا بھائی مر گیا ہے۔ ایک معصوم بچے کے دل میں ایسی حالت میں کس کس قسم کے خیالات موجزن ہو سکتے ہیں۔ اور وہ اپنی سیدھی سادی زندگی اور سمجھ کے مطابق بھائی کے ناگہاں غائب ہو جانے کی نسبت کیا کچھ سوچ سکتا ہے۔ اس نظم سے کسی حد تک اس کا اندازہ ہو سکتا ہے منشی صاحب مرحوم کی نظم پر چند اشعار میں حسب دلخواہ ردوبدل کرنے کے بعد یہ تضمین کی گئی اور کچھ عرصے کے بعد رسالہ "گلشن" لاہور میں شائع ہوئی۔

"بچہ":—

بھائی کو مرے کیا ہوا اماں یہ بتا دو — کچھ حال خدا کے لیے اس کا تو سنا دو

دیکھا نہیں برسوں سے اُسے لا کے دکھا دو — اماں مری اماں مرے بھائی کو بُلا دو

اس کام میں پیسہ نہیں دھیلا نہیں جاتا

پر مجھ سے اکیلا کہیں کھیلا نہیں جاتا

"ماں":—

کیا تجھ کو بتاؤں ترے بھائی کا پتہ اب — وہ ایسی جگہ ہے کہوں اس کو کہ آب
وہ چاند ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا اب — تو دیکھ سکیگا نہ اُسے ماہ لقا اب

اب آپ کو بھی غم کے حوالے نہ کرو تم
اس بات کو جانے بھی دو نالے نہ کرو تم

بچہ:-

باغوں کے سرِ گشت کو اُڑ جاتے ہیں بھونرے — رس پھولوں کلیوں کے لینے کے لیے آتے ہیں بھونرے
بھائی ہو تو پھر جانے کہاں پاتے ہیں بھونرے — ہم اور وہ اب جا کے پکڑ لاتے ہیں بھونرے

جس طرح سے تم مرے بھائی کو دکھا دو
اک بات نہ مانوں گا میں بھائی کو ملا دو

ماں:-

افسوس مرے بچے میں کیا ہو گئی کیا تھی — بھائی پہ ترے جان نگوڑی کی فدا تھی
تم کھیلو کیا یہی مرضی خدا تھی — پھر لاؤ گے اے لال کہاں سے کوئی ساتھی

بھائی کے عوض اور سے کھیلو گے بیٹا
یا ساتھ دوسی کوئی لے لو گے بیٹا

بچہ:-

ہو ٹالتی باتوں میں ستاتی ہو مجھے کیوں — اماں یہ ہرے باغ دکھاتی ہو مجھے کیوں
اچھی مری اماں یہ اڑاتی ہو مجھے کیوں — نا نا میں نہ مانوں گا مناتی ہو مجھے کیوں

آنے سے مرے بھائی کو روکے گا بھلا کون
کیوں اس کو قضا لے گئی ہوتی ہے قضا کون

"ماں":-

کیا تجھ سے کہوں میں کہاں عجلت میں گیا وہ
یوں چھوڑ کے ہم سب کو مصیبت میں گیا وہ

فردوس کے معصوموں کی دعوت میں گیا وہ
اب آ نہیں سکتا ہے کہ جنت میں گیا وہ

کیا اور بتائے تمہیں اماں یہ تمہاری
دو آنکھیں تھیں جاتی رہی اک آنکھ ہماری

"بچہ":-

اماں مری اماں مری کچھ ہوش سنبھالو
جو بات نہ مانوں میں وہ منہ سے نہ نکالو

باتیں نہ بناؤ مجھے بہلا کے نہ ٹالو
میں روٹی نہیں کھانے کا جاؤ تمہیں کھالو

میں اس کو نہ چھیڑوں گا اگر آئے دوبارا
افسوس کہ میں نے کبھی ناحق اُسے مارا

"ماں"

کیا خونِ جگر پی کے تھا پالا اُسے میں نے
اس گھر کا بنایا تھا اُجالا اُسے میں نے

سکھ چین کا سمجھا تھا اِک آلا اُسے میں نے
باہر کبھی نہ گھر سے نکالا اُسے میں نے

کیا علم تھا یوں موت اُسے آئیگی بیٹا
جوڑی تری ناگاہ بچھڑ جائے گی بیٹا

بچہ:-

وہ روٹھ کے ہم کو نہ اگر چھوڑ گیا ہے
کیوں مجھ کو اکیلا وہ ادھر چھوڑ گیا ہے

مانا کہ وہ لڑ بھڑ کے نہ گھر چھوڑ گیا ہے
کیوں اپنے کھلونے وہ مگر چھوڑ گیا ہے

جس طرح سے ہو میرے کھلیا کو بُلا دے
اچھی مری اماں مرے بھیّا کو بُلا دے

"ماں":۔

اے نورِ نظر جبکہ جدا جزو ہو کُل سے — مل جائیگا کب بیٹھیں ڈھونڈو وا جُو دل سے
وہ ہاتھ نہیں آنے کا اب شور سے غل سے — ہر جزو جدا ہوتا ہی آفاق سے کُل سے

دکھلائیگا ایشر جو ہمیں سب وہ سہینگے
سب ہونگے میرے لال ہمیں تم نہ رہینگے

"بچہ":۔

اے کاش وہ پھر آئے کروں جان بھی ملہار — پھر اس کو کلیجے سے لگاؤں ہیں کروں پیار
بے اُس کے جلا جاتا ہے ہنا مرا گلزار — دیکھو نہ مرے پھول بھی اب ہو چلے تیار

کس شوق سے دونوں نے بنایا یہ بغیچا
وہ چلدیا جب کھلنے پہ آیا یہ بغیچا

"ماں":۔

اے پیارے کبھی ٹلتی ہی جو موت کی ہی آفات — اب سُرگ میں ممکن ہو تری اس سے ملاقات
دو دن کی یہ دنیا ہے یہ مایا ہے طلسمات — ہم سب مسافر ہیں۔ بازار اجل گرم ہے دن رات

ان باتوں کو ہو کر بڑے جانو گے مری جان
جب عمر کو پہنچو گے تو سمجھو گے مری جان

——— ۰۰۰ ———

(۸)

عمرِ رفتہ کی یاد اور پیری کا خیر مقدم

۹ر نومبر ۱۹۱۶ء غیر مطبوعہ

آہ اے بچپن! لڑکپن!! آہ وہ دلکش سماں
کیا ہوئیں تیری ادائیں اور وہ نیرنگیاں

جستجو میں تیری کھو بیٹھا ہیں اپنے آپ کو
ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتا ہے اب تیرا نشاں

بھول جائینگی کبھی کیا شفقتیں ماں باپ کی
ہائے وہ دوشِ پدر آغوشِ مادر اب کہاں

وہ مچلنا - روٹھنا اور خاک پہ وہ لوٹنا
اور زبانِ گریہ سے احوالِ دل کرنا بیاں

آکے غصّے میں کبھی بھائی بہن کو مارتا
چیخنے رونے کا برپا جس سے ہوتا اک سماں

نوچ ڈالیں ننھے ہاتھوں سے کسی کی بالیاں
توڑ ڈالیں ایک کے میں کسی کی چوڑیاں

جھولنا جھولے پہ تھا جب نیند آتی تھی مجھے
دوشِ مادر تھا سواری کے لیے تختِ رواں

جب ہوا بچپن تمام اور آئے کچھ ہوش و تمیز
تو نظر آیا مجھے کچھ اس سے بڑھ چڑھ کر سماں

ماسٹر کی مار سے بیمار ہوتا تھا کبھی
درد میرا دور کرتی تھیں تمہاری چٹکیاں

اس طرح کرتا کلولیں مختلف اقسام کی
جن کے لکھنے سے قلم قاصر ہے عاجز ہے زباں

یادِ رفتہ میں امنڈ آئے نہ یہ طبعِ گداز
چھوڑتا ہوں یہ کہانی اور کرتا ہوں بیاں

بعد ازیں دورِ جوانی بر سمند شد سوار
راہ طے را رہ رواں گشت اسپ تیز را

آہ اے عہدِ جوانی آہ اے دورِ شباب / چھوڑ کر مجھ کو کہاں جاتا ہے با صد اضطراب

درحقیقت تھا یا دیکھا تھا میں نے تیرا خواب / تیرا جانا تھا خرامِ برق یا جگنو کی تاب

پشتِ خم اور دستِ لرزاں کے سبب سمجھے نہیں / ڈھونڈھتا نقشِ قدم تیرا ہوں با چشمِ پرآب

اے جوانی تھا تجھی سے زندگانی کا مزا / تیرے جانے سے دیا ہے عیش و عشرت نے جواب

باعثِ فرحت تھا تیرا حسن غیروں کے لیے / اب تو میری جان کی خاطر بنا دار العذاب

تیری خوبی اے جوانی سنگِ مقناطیس تھی / تیری چوکھٹ آہنی دل کے لیے احسن المآب

نشۂ مستی میں تھا مخمور رہتا رات دن / ولولے جوشِ جوانی کے تھے بے حد و حساب

آئینہ سیما تھا میں اسکندر ثانی تھا میں / تیرے جانے سے جبیں پر بل پڑے مثلِ سراب

یاد آیا ہے کہ اخباروں کی چاہت تھی مجھے / زندگی کالج کی تھی شیریں مثالِ شہدِ ناب

اب نہ وہ ذوقِ مسرت ہے نہ وہ پروازِ شوق / مرغِ جاں کے واسطے ہے اک قفس جسمِ خراب

سعی سے ہوتا نہیں وقتِ خزاں فصلِ بہار / بال و پر تبدیل کر سکتا ہے کیا بطّے سے غراب

ترک کن طالب تو ایں سعی عبث ایں جستجو
چشم دریا بار آبِ رفتہ کے آید بجو

چونکہ اے پیری ابھی میں تجھ سے قدرے دور ہوں
اس لیے اوصاف لکھنے سے ترے معذور ہوں
تیری صحبت سے بھلا کس طرح ہو ممکن گریز
تجھ سے تو وابستہ رہنے کے لیے مجبور ہوں
لطفِ پیری کا ہے مردوں کو جوانی سے سوا
ترشیِ غورہ میں ہوں لذتِ انگور ہوں

غفلتِ عہدِ جوانی میں کہاں انوارِ حق
میں شبِ یلدا میں روشن مشعلِ کافور ہوں
تیری صحبت میں مجھے آئے نظر نورِ خدا
دم قدم تیرا ہے برقِ طور اور میں نور ہوں
تیرے آنے کو سمجھتا ہے جہاں پیکِ اجل
میں مگر اس رائے کی تائید سے معذور ہوں
گو مقولہ "پیری و صد عیب" کا مشہور ہے
میں بڑھاپے کے ہنر کو دیکھکر مسرور ہوں
میں اسی پیری میں ہوتا ہوں حقیقت آشنا
کیونکہ غفلت سے جوانی کی میں اب کچھ دور ہوں
بند ہوتی ہے کسی حد تک نگاہِ حرص و آز
بزمِ عرفاں میں روشن مثلِ شمعِ نور ہوں
ہاں اگر اس دورِ پیری میں بھی غافل ہی رہا
اُٹھ سکے بارِ گنہ جس سے نہ وہ مزدور ہوں
جاگ اے غفلت کہ اب آیا ہے سر پر آفتاب
کہتی ہے پیری کہ ہم آخر صدائے صور ہوں

	الوداع اے مستی و اے غفلتِ عہدِ شباب خیر مقدم اے زمانِ پیریم برکش نقاب	

(۹)

ماں کی تصویر

عرصہ ہوا انگریزی کے مشہور شاعر ولیم کاؤپر کی نظم بہ عنوان "مادر پکچر (رسٹیپہ مادر) راقم کی نظر سے گذری۔ چاہا تھا کہ اس کا اردو ترجمہ پبلک کے پیش کروں۔ ہرچند ترجمے میں وہ لطف قائم نہیں رہ سکتا جو اصل نظم میں پایا جا سکتا ہے۔ تاہم اس خیال سے کہ اردو داں اصحاب بھی ایک انگریزی شاعر کے ولی جذبات اور نیچرل خیالات کا اندازہ کسی حد تک اس ترجمہ سے لگا سکیں یہ شوق پیدا ہوا۔ مگر اس وقت مصروفیت کی وجہ سے اس خیال کو ملتوی رکھنا پڑا۔ آخر کچھ مدت کے بعد ایک اسکول ریڈر میں اس نظم کا انتخاب دیکھنے میں آیا۔ اس کو پڑھکر راقم کا دل از سر نو پھڑک اٹھا۔ اور اس کے ترجمہ کرنے پر مجبور ہوا۔ یہ نظم تقریباً تین سال کے بعد ۲۱ء میں منشی گوری شنکر لال صاحب اختر ایڈیٹر رسالہ "تیکوتنبھو" لاہور کے طلب کرنے پر ان کی خدمت میں بھیجدی گئی اور شائع ہوئی۔



(۱)

کاش اماں لب ترے پھر مائل گفتار ہوں
مامتا سے پھر ترے الفاظ شکر بار ہوں

جب سے اے ماں گئی تو زندگی دشوار ہے
دور شفقت سے تری جیتے سے دل بیزار ہے

دیکھتا ہوں لب وہی ہیں مسکرانا بھی وہی
بس کمی آواز کی ہے ورنہ لب کہتے ہیں صاف

اور بچپن میں دلاسے کا دلانا بھی وہی
ہو نہ تو مغموم بچے خوف سے کر انحراف

(۲)

پائی تھی میں نے خبر جب تیرے اٹھ جانے کی جاں
روح تیری آئی کیا میرے دلاسے کے لیے
بے خبر تھا مجھ کو جو ہوگا تو نے پیار سے
آہ! تیرا مسکرانا اور وہ ماورانہ شوق سے
سن لی روزِ مرگ میں نے تیرے گھنٹے کی صدا
تاک کر میں مہد سے یہ حال اک دم ہو گیا

تھا تجھے معلوم کیسے تھے مرے آنسو رواں
اپنے بے ماں کے یتیم اور ننھے بچے کے لیے
اور آنسو بھی گرائے ہوں گے چشم زار سے
کر رہا تھا پیدا اس کی کیا ہی عمدہ ذوق سے
دیکھا وہ تابوت جس میں لے گئی تجھ کو قضا
تجھ کو رخصت کر دیا اور آپ بیدم ہو گیا

(۳)

بیٹھنا تھا ہائے جس آغوش میں وہ کھو گیا
درس گہ میں ساتھ لے جاتا تھا رابن والا غباں
تھا لباس سرخ زیبِ تن عرادہ پر سوار
مسکن اپنا گاؤں میں جو تھا وہ اب ویران ہے

ڈھونڈتے پھرتے ہیں تیرے بچے اب اس کا پتا
تاکہ میں علم و ہنر حاصل کروں جا کر وہاں
مخملی ٹوپی دکھاتی تھی عجب سر پر بہار
نام تک باقی نہیں اللہ کی یہ شان ہے

(۴)

رات کو کمرے میں میرے بارہا آتی تھی تو
تیرے الطافِ سحر گاہی تھے افزوں اس سے
عطر اور خوشبوئیں منہ پر میرے ملتی بارہا
یہ تو سب کچھ تھا سو تیری تھی اس سے ماں تمنا

گرمی و آرام سے مجھ کو سلا جاتی تھی تو
روٹی مکھن جب کھلاتی مجھ کو اپنے ہاتھ سے
اپنے ہاتھوں سے بناتی تھی اسے یوں خوشنما
کیا کہوں الطاف تیرے مجھ پہ کیسے تھے بہا

صفحۂ دل پر ابھی ہیں ثبت یہ نقش و نگار	بعد مرنے کے بھی یہ نقشہ رہیگا پائیدار
فرض کی میری خوشی بڑھی ہے ان اشعار سے	بولتی ہے امتا تیری لب اٹھا رہے
نظم ہو مفقود گر قائم ہے تیری یادگار	جنت الماوا میں بھی دکھلائیگی اپنی بہار

(۵)

آہ! اے وقتِ گذشتہ آ پلٹ تیری ہو یاد
جبکہ پوشاکِ منقش سے میں ہو جاتا تھا شاد
لیکے میں گلہائے رنگیں رغواں - گیندا - کنول
صفحۂ کاغذ پہ نقاشی کا کرتا تھا عمل
ہوتی تھی مسرور مجھ سے بڑھکے پھر اس آن تو
دستِ شفقت سر پہ رکھتی ہنس کے کرتی گفتگو
ہے تمنا کاش وہ دن وہ سماں ہو پھر نصیب
اے جنابِ با شفیق لائے ان کو پھر میرے قریب

قومی نظمیں

(۱)

سروس لیگ سرینگر کا سالانہ جلسہ

مارچ سنہ ۱۹۱۸ء میں راقم کے چند ہم جماعتوں نے سری نگر میں فتح کدل کے قریب ایک ریڈنگ روم اور لائبریری قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ کافی غور و خوض کے بعد اس خیال کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ ریڈنگ روم اور لائبریری دونوں نہایت دھوم دھام سے تین سال تک برابر چلتے رہے۔ اس کی کامیابی زیادہ تر پنڈت ہیشر ناتھ صاحب مٹو۔ بی۔ اے کی کوششوں اور جانفشانی کا نتیجہ تھی۔ جو کافی عرصے تک اس کے سکرٹری رہے۔ اور جن کے دل میں حب وطن اور حمیت قومی کا تیز احساس موجود ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں ریڈنگ روم کے ساتھ ایک ایسوسی ایشن بھی شامل کی گئی۔ جس کا نام "سروس لیگ" رکھا گیا۔ اس کا خاص مقصد غریب غربا کی امداد اور بیماروں اور مصیبت زدوں کی اعانت کرنا تھا۔ اپریل سنہ ۱۹۲۱ء میں اس کا سالانہ جلسہ زیر صدارت خواجہ عبد الصمد صاحب ککرو مرحوم رئیس کشمیر منعقد ہوا تھا جس میں شہر کے رؤسا وکلا اور دیگر معزز اصحاب شامل تھے۔ راقم ان دنوں ایسوسی ایشن

ریڈنگ روم اور لائبریری کا سکرٹری تھا۔ احباب نے اس موقع پر ایک نظم لکھنے پر مجبور کیا۔ چونکہ یہ ایک فرمائشی نظم ہے۔ اسی میں انہی کے خیالات اپنی زبان سے ادا کیے گئے ہیں۔

صبا آج خبریں اڑاتی ہے کیا کیا
پیام مسرت سناتی ہے کیا کیا
فضا دل کو وعدے دلاتی ہے کیا کیا
ہر اک غنچۂ دل کھلاتی ہے کیا کیا

ہے کس میہماں کی یہاں آمد آمد
کہ کہتے ہیں پیر و جواں آمد آمد

ہے شبنم نے دھویا کہیں عارض گل
صبا نے سنواری ہے سنبل کی کاکل
کہیں نغمہ ریزی میں مشغول بلبل
ہے عیش سے مست یہ باغ ہے کل

غرض ہر طرف جوش الفت ہے پیدا
یہ کشمیر میں اک نیا ہے تماشا

کہیں بزم عشرت ہوئی دم میں برپا
کہیں شاہد گل ہوا جلوہ آرا
سنا ہر طرف سے یہ شور دعا
کوئی پاس تھا اس سے یوں میں نے پوچھا

یہ کیا تذکرہ ہے یہ کیا گفتگو ہے
یہی دھوم کس واسطے چار سو ہے

یہ کیا جا بجا آج ہوتا ہے چرچا
یہ کیا جشن ہے یہ تماشا ہے کیسا
یہ سن کر ہوا اس طرح پھر وہ گویا
ہے پبلک کی سروس کا یہ لیگ اپنا

خبر کیا نہیں تجھ کو اے یارِ ناداں
ہوئیں قوم کی مشکلیں اس سے آساں

یہ قائم جو قومی شوالا ہوا ہے
جبھی قوم کا بول بالا ہوا ہے
اسی کا یہ جلسہ نرالا ہوا ہے
اندھیرے میں اک دم اجالا ہوا ہے

ہوئیں سب کی آنکھیں منور اسی سے
یقیں گر نہ آئے تو پوچھو کسی سے

فلک پر وطن کے ستارا یہی ہے
ہر اک اہلِ جوہر کو پیارا یہی ہے
ہر اک ناتواں کا سہارا یہی ہے
مصیبت میں حامی ہمارا یہی ہے

دکھوں سے وطن کو بچایا ہے اس نے
اصولِ اخوت سکھایا ہے اس نے

خبر قوم کی وقت پر لی ہے اس نے
مریضوں کو امداد بھی دی ہے اس نے
دکھائی یہ راہِ ترقی ہے اس نے
خبر جب بھی کالرا[1] کی ہے اس نے

عصا پیر کا ہے یہ ہمت جواں کی
اسی سے بڑھی شان خورد و کلاں کی

بہم آج سارے خوشی کے ہیں ساماں
بھرے دُرِ مقصود سے سب کے داماں
ہوئے آشکارا ہیں سب رازِ پنہاں
دل و جاں ہوں لیگ پہ کیوں نہ قرباں

[1] ان دنوں سرینگر میں کالرا کی بیماری کا بہت زور تھا۔ ممبرانِ لیگ نے اس کے انسداد کے لیے کافی کوشش کی۔ (طالب)

بلند آج ہوتا ہے قومی ترانہ ؎
خدا نے دکھایا خوشی کا زمانہ

خدایا ترا ہی ہمیں آسرا ہی | تو ہی کشتیٔ قوم کا ناخدا ہی
تو ہی رہنما اور مشکل کشا ہی | دعا تجھ سے طالب یہی مانگتا ہی

پھلے اور پھولے یہ مجلس وطن کی ؎
دوبالا ہو رونق ہمارے چمن کی

(۲)

تصویر قوم

یعنی

ترانۂ طالب

اپریل ۱۹۲۱ء میں ینگ مینز اون سروس لیگ کا سالانہ جلسہ دھوم دھام سے منایا گیا جس کا تذکرہ مندرجۂ بالا نظم میں ہو چکا ہے۔ چونکہ اس جلسے سے عوام میں رفاہِ عام کا ولولہ پیدا ہوا۔ میرے گرامی قدر دوست پنڈت شمبھوناتھ صاحب ضا در

Young mens own Service leage ol

بی۔اے۔ایل۔ایل بی نے مجھ سے ایک قومی نظم لکھنے کی فرمائش کی۔اس فرمائش کی تائید دیگر ممبروں نے بھی کی جن میں سے پنڈت مہیشہ ناتھ صاحب مٹو بی۔اے۔پنڈت ذنارون صاحب ٹینگ ایم۔اے ایل۔ایل۔بی۔ وکیل ہائی کورٹ سری نگر اور پنڈت جیالال صاحب صراف۔بی۔اے۔ اسسٹنٹ منیجر شالی ڈپارٹمنٹ سرینگر۔پنڈت رگھا ناتھ صاحب زتشی بی اے مرحوم۔کے نام خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ایسی نظم کے لکھے جانے کا مدعا یہ تھا کہ شاید لیگ کے ممبر پیشتر سے زیادہ سرگرمی اور ہمت سے کام کرنے پر آمادہ ہوں راقم کے دل میں بھی اس قسم کی نظم لکھنے کا خیال مدت سے جاگیر تھا اور نیز اس خیال سے کہ ممکن ہی کہ ایسی نظم اگر دس میں سے نہیں تو سو میں سے کسی ایک کا حوصلہ بڑھا دے اور اپنی پستی محسوس کرائے۔ ذیل کا مسدس لکھا۔لیگ کے ممبروں نے اس نظم کو پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا اور کتابی صورت میں اس کے شائع کیے جانے پر اصرار کیا۔لہذا راقم نے اس نظم کو اپنے استاد نامدار جناب قبلہ و کعبہ پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی کی خدمت میں جموں ارسال کیا۔جو ان دنوں دربار کشمیر کے ساتھ وہیں مقیم تھے۔انھوں نے بھی اس کو پسند فرمایا اور شائع کرنے کی تاکید کی بلکہ میری درخواست پر اپنی دو رباعیاں بھی ارسال فرمائیں جن کو تبرکاً اس پمفلٹ کے ساتھ شائع کیا۔پمفلٹ مذکور اگست ۱۹۲۲ء میں چھپا۔اور ممبروں لیگ کے نام پر ڈیڈیکیٹ کیا گیا۔اصلی نظم کے شروع ہونے سے پہلے استاد نامدار کی مذکورہ بالا رباعیات بھی درج کی جاتی ہیں یہ مسدس اخبار عام

لاہور اور بہارِ کشمیر لاہور میں بھی چھپ چکا ہے۔

رباعی

ہیں یوں تو بہت شور مچانے والے — اصلاح کے غل سے سر پھرانے والے
اے قوم بتا کہ آج تجھ میں کتنے — ہیں بن کے مثال خود دکھانے والے

دیگر

تقدیر کے شکوہ ہائے بیجا کب تک — ناسازیِ مقسوم کا رونا کب تک
ہے اپنی ہی ذات سے شکایت ہم کو — بے مہریِ آسماں کا شکوہ کب تک

ہے دل میں آج اپنی قوم کا دکھڑا سناؤں میں — زبانِ کلک سے کچھ دردِ دل اپنا سناؤں میں
صدائے نالۂ غم سے ہمدموں کو رلاؤں میں — رگِ غیرت کو مردہ دل کی بھی جنبش میں لاؤں میں

نہفتہ آنچہ در دل سوزِ غم دارم عیاں سازم
ز چشمِ خوں چکانِ خامہ دریائے رواں سازم

دکھاؤنگا کہ شیرازہ ہی بکھرا قوم کا کیسا — خیالاتِ پریشاں کا چڑھا ہے دل پہ کیا کیا
اڑایا کس طرح بادِ خزاں نے سر بسر خاکا — ملایا خاک میں کیونکر چمن کا ہر گلِ رعنا

یہیں سے داستانِ غم کی اک تصویر کھینچونگا
نہالِ آرزو کو خونِ ہمدردی سے سینچونگا

دلِ افسردہ سے اک قوم کا نوحہ سناؤنگا — نفسِ آہ و فغاں کو ترجمانِ دل بناؤنگا
نوائے شورِ غم تارِ نفس پر میں بجاؤنگا — قلم سے قوم کی بگڑی ہوئی حالت بتاؤنگا

دلِ آہن دلاں را چوں دلِ کشمیر میسازم
جہاں را محوِ حیرت عالمِ تصویر میسازم

نہیں حورو پری کا وصل ہرگز مدعا میرا
نہ شیخ و برہمن سے کفر و دیں کا ہے کوئی جھگڑا
نہ مال و زر کی خواہش ہے نہ شوقِ دلربا
ترقی وطن کا بس ہوں میں تو عاشق شیدا

دعا ہے ذرۂ خاکِ وطن اکسیر ہو جائے
نگینِ نقشِ اہلِ دل مری تحریر ہو جائے

میں عاشق ہوں عروسِ حبِ قومی کا حسینوں میں
تلاش نامداری مجھ کو ہے قومی نگینوں میں
کہ در دیر و کلیسا و مساجد بانگِ جرس باشند
مجھے الفت ہے معشوقِ وطن کی نازنینوں میں
عزیزوں، رازداروں، دوستوں میں ہمنشینوں میں
اگر در خانہ کس باشد یک حرف بس باشند

بنے صفحۂ قرطاس میرا وادیِ محشر
طلوع آفتاب قوم ہو سوئی ہوئی یکسر
صریرِ خامہ صورِ حبِ قومی کا بنے مظہر
وہ جاگ اٹھے کہیں فریاد و نالہ کا غل سن کر

قبولِ گوشِ شنوا یہ صدائے نارِ دل ہو
پسندِ چشمِ بینا یہ نشانِ راہِ منزل ہو

کلیدِ قفلِ بابِ آرزو ہو داستاں میری
کرے اک ولولہ پیدا یہ آہِ ناتواں میری
کرے قومی رگوں پر کارِ جراحی زباں میری
نسیمِ روح افزا بن کے نکلے ہر فغاں میری

گلے بو بیم کہ ہر یک برگِ او رنگِ صفا دارد
دلِ درد آشنا جو ییم کہ احساسِ وفا دارد

اٹھاؤں ساز و ساماں کہیں اب ابنِ مریم سے
دکھاؤں قوم کا رتبہ نمودِ نشانِ پرچم سے

چمن کے خار و خس کو پھونک دوں اعجاز کے دم سے
اتاروں قوم کا فوٹو میں پردۂ دل کے البم سے

کہیں سب دیکھ کر صد آفریں نقاش ایسا ہو
جو کھینچے اصلی صورت نکتہ بیں نقاش ایسا ہو

دوبارہ شاہدِ مطلب ہو محوِ جلوہ آرائی
ملے پیاسوں کو اس کی دید سے آبِ شکیبائی
نصیبِ دشمنانِ قوم ہو یہ مرگِ رسوائی
کرے احساسِ غیرت یک بیک کارِ مسیحائی

ہر یکا مرا فی قوم را بخت رسا باشد
بسر یلمش ہماں خاصیتِ بالِ ہما باشد

کمالِ علم و فن اپنا دوبارہ رشکِ دوراں ہو
غبارِ خاکِ ہمت سرمۂ چشمِ عزیزاں ہو
وطن کے اہلِ جوہر کا نمونہ پھر نمایاں ہو
افق سے قوم کے پھر نیّرِ اقبال تاباں ہو

گلہ جاتا رہے سب بختِ بد کی خشک سالی کا
بنے تقویمِ پارین قصہ اپنی زیر حالی کا

نہ کوئی خضرِ رہ کر راستہ سیدھا دکھاتا ہے
نہ کوئی منزلِ مقصود کا مسلک بتاتا ہے
غضب ہے خاک میں چرخِ کہن ہمکو ملاتا ہے
وہ حالت ہو گئی اب تو کلیجہ منہ کو آتا ہے

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم در کشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

اگر حالت یہی ہے پھر عبث شیریں مقالی ہے
مرض یہ لادوا ہے اور اپنا ہاتھ خالی ہے
غم و اندوہ جاں فرسا ہے جس سے پائمالی ہے
یہی حالت رہی تو اپنا پھر اللہ والی ہے

چلو نگارا راہِ غم میں سرِ اندوہِ وطن لیکر
بغل میں داغِ دل ہمراہ حسرت اور محن لیکر

بنی ہے قوم اپنی کس لیے تصویر حسرت کی — الم کی درد کی وحشت کی غم کی اور دقّت کی
نذلت کی مصیبت کی فلاکت اور نکبت کی — یہ سر پر اس کے مایوسی ہے کیوں بپا قیامت کی

چرا شد مبتلا ایں قوم ما در بند حیرانی
چرا در گردنش افگندہ شد طوق پشیمانی

ہوا کیوں دخل اب قوم میں بادِ خزانی کا — پتا ملتا نہیں کیوں اس میں نخلِ شادمانی کا
ٹھکانا کیوں نہیں ہے آج قومی ناتوانی کا — شرارہ کیوں ہے رائگاں سوزِ نہانی کا

سناؤں گا جو تم کو سب وہ گوشِ ہوش سے سن لو
مگر یہ شرط ہے ضبطِ الم کا حوصلہ بھی ہو

تمہارا حال جو دیکھا گوارا ہو نہیں سکتا — کوئی پستی میں ثانی اب تمہارا ہو نہیں سکتا
کہوں گا برملا اب میں اشارا ہو نہیں سکتا — کہ اس موجودہ حالت پر گذارا ہو نہیں سکتا

دریغا دوستاں وائے صد افسوس واویلا
صدائے برنمی خیزد ازیں ناقوس واویلا

بتا اے قوم آخر اس قدر تو ناتواں کیوں ہے؟ — بتا تجھ سے جہاں میں سرگراں آسماں کیوں ہے؟
بگولہ کی طرح سرگشتہ تیرا کارواں کیوں ہے؟ — ٹھکانے کا پتہ ملتا نہیں کیا بے زباں کیوں ہے؟

تجھے کس منہ سے دعویٰ ہو سکے گا استقامت کا؟
فضیلت کا لیاقت کا ذہانت کا نجابت کا؟

کہاں اے قوم تیری اب وہ پہلی شان شوکت ہے؟ — کہاں وہ جاہ و عظمت حشمت و اعزاز و صولت ہے!
کہاں جوشِ اخوت اور وہ قومی حمیت ہے؟ — کہاں وہ جاں نثاری اور وہ خوئے محبت ہے!

خوش آں عہدے کہ خاکت را نظرگاہے می گفتند
چو عرفی و نظیری گوہرِ مدحِ تو سفتند

نہیں اے قوم تجھ میں اکتسابِ علم و فن باقی
نہ وہ باغِ سلیماں ہے نہ یونان کا حکمت باقی

لگا غیروں سے ہمدردی نہیں حبِ وطن باقی
اگر باقی ہے کچھ تو دل میں ہے رنج و محن باقی

عروجِ بخت و دولت اب وہ تیرا اک فسانہ ہے
ہے اب مردوں میں ملنے کو یہ ماتم کا زمانہ ہے

لگا کر شرط مردوں سے ہے سوتی کیوں یہ پیاری!
نہ بدلی تو نے کروٹ اور گئی دنیا بدل ساری

نہیں غفلت سے لیتی خواب میں بھی نام بیداری
مگر تو مستِ خواب اپنا سر ہی لے اڑے سرشاری

خدا را یک زمانے دیدہ وا از خوابِ مستی کن
نگاہ از عینِ عبرت در وجودِ خویش و ہستی کن

ستمکش ہو رہیگی کب تک اس قعرِ پستی میں؟
ہلا ہیگی نہ گر تو دست و پا اس تنگدستی میں

تنزلی تو رہیگی آہ کب تک قیدِ ہستی میں؟
رہیگی تا قیامت پا بجولاں فاقہ مستی میں

رہیگی بن کے تو یوں طعمۂ رنج و بلا کب تک
کھلیگی غیر کو تو خوانِ یغما بر صلا کب تک

جو خواہش ہے ترقی کی تو کچھ ساماں پیدا کر
بنے سرتاج قوموں کی بلند ارمان پیدا کر

سبق غیروں کو حاصل تجھ سے ہو وہ شان پیدا کر
تو دل میں جذبۂ الفت بدن میں جان پیدا کر

بنا شد رستگاری جانِ من در فرقہ بندیہا
بجو ایں گوہرِ مقصود اندر دردمندیہا

نکل آئیگی اک دن آرزو تو دل میں رہنے دے
حسینِ جستجو کو نشۂ منزل میں رہنے دے
ابھی اس شمعِ افسردہ کو تو محفل میں رہنے دے
سرابِ تشنگی کے ذروں کو تو محمل میں رہنے دے

ابھی ہے ابتدائے عشق دیکھیں انتہا کیا ہو
دکھاتا کیا ہے چرخِ پیر قسمت کا لکھا کیا ہو

زمانہ اب جو بدلا ہے ملا دے اپنی تو رسمیں
بڑی کب تک رہیگی خامشی سے کنجِ محبس میں
تو ہو دلدادۂ تہذیبِ نو اب ان کو کر بس میں
خدا را اٹھ اسیری کی تو کیا ہے کھا چکی قسمیں

تو بہارِ جہاں اے قوم گر تو پاس ہا دارم
اگر احوالِ تو نسبت پس و سواس ہا دارم

زباں و دل تری حالت پہ تھے آزردہ گریں سب
پریشاں تو رہی ہے مثلِ زلفِ عنبریں سب
ترے غم میں تھا باہم دلِ چشم و آستیں سب
دکھا وہ نقشِ جمعیت ہے جو دلنشیں سب

مٹا دیگا زمانہ تجھ کو کیا جب ہوش آئیگا؟
رگوں میں جب لہو ٹھنڈا ہو پھر کیا جوش آئیگا؟

ستارہ چرخِ شہرت پر ترا چمکا ہوا نکلے
وہ رفعت ہو تجھے حاصل کہ دل کا مدعا نکلے
ترا اک اک بشر اہلِ جہاں کا رہنما نکلے
زباں سے ہر بشر کی آفریں و مرحبا نکلے

جہاں تحسیں کند خفا کہ ہمت اینچنیں باید
ذہانت اینچنیں شاید لیاقت اینچنیں باید

وہ قومی جاہ و عزت کا نشاں یا رب عجب گر آئے
چمن شاداب ہو نخلِ تمنا میں ثمر آئے
دلِ ہر اہلِ ہمت سوزِ ہمدردی سے بھر آئے
کبھی تو یا الٰہی شامِ نکبت کی سحر آئے

نہ ہوگا کب تلک اس بیڑے کا مالک یا خدا کوئی
بنے اس ناؤ کا آخر خدا را ناخدا کوئی

فلک کے رحم پر بس قوم کو چھوڑا ہے یاروں نے
جو کی پہلو تہی اس درد و غم میں غمگساروں نے

جلایا خرمن قومی کو غفلت کے شراروں نے
پیادوں کو بہ سطح راہ چھوڑا شہسواروں نے

کنار عافیت پیدا نہ در ایں بحر می بینم
بہ قید حسرت و غم مبتلا یک شہر می بینم

اُمیدیں خون ہیں دل اک نشانہ داغداروں کا
نہ پوچھو حال کیسا ہو گیا ندامت کے ماروں کا

بنا ہے ملک اپنا آج تختہ لالہ زاروں کا
ہر اک دفتر میں ہے اک جمگھٹا امیدواروں کا

ہیں بی اے اور ایم اے جتنے ہمت ہار بیٹھے ہیں
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

ہزار افسوس قوم اب اپنی عزت کھونے والی ہے
یہ ننھی جان آغوش عدم میں سونے والی ہے

ہزار افسوس یہ غرقاب کشتی ہونے والی ہے
یہ داغ ہستی موہوم دل سے دھونے والی ہے

شکستہ پا گرفتن کے تواند دوستداران را
جمہور لنگ ہمراہی کند موٹر سواران را

ہیں پہنچے منزل مقصد تلک سب قافلے والے
یہ کیوں سوئے پڑے ہیں ڈس گئے ہیں کیا انھیں کالے؟

پڑے ہیں ان کو جو ہیں پست ہمت جان کے لالے
ہوا کیا ان کو کیوں ہیں یاد وہ غفلت کے متوالے

مرے جو جو دیے ہیں قوم یوں عشرت کے نوحے
تو مستی اور واس کی رہے گی آس ٹوٹ گئی

جو قومی جھگڑے تھے پھر ہر بنا اٹھنے جاتے ہیں
جو بستے گھر وطن کے تھے وہ ویران ہوتے جاتے ہیں

نہاں حسرت بھرے سینوں میں ارماں ہوتے جاتے ہیں
غضب اہلِ نظر آنکھوں سے پنہاں ہوتے جاتے ہیں

نہ آں ساقی نہ آں محفل نہ آں میخانہ می بینم
کہ تاریخ عروج ملک یک افسانہ می بینم

بہت آگے بڑھے ہیں دیکھنا سب کارواں والے
بڑھے جاتے ہیں ہر گھڑ دوڑ میں ہندوستاں والے
چڑھے ہے دن ہوئے بیدار ہیں خوابِ گراں والے
مگر بستی میں ہیں کشمیر کے اونچے نشاں والے

سُنائیں کس کو دردِ دل یہاں پر کون سُنتا ہے
الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد یہاں ہر ایک چُنتا ہے

غم افزا حلقۂ ماتم سے بھی ہے انجمن اپنی
سیہ ہے شامِ غربت سے سوا صبحِ وطن اپنی
قفس سے تنگ تر ہے وسعتِ صحنِ چمن اپنی
ہے تنگ اب قیدِ تن سے آہ جانِ پُرمحن اپنی

تنزل کے مرض نے اس پہ بدڈھب ہاتھ ڈالا ہے
سنبھلنا دوستو سمجھے ہو جس کو وہ سنبھالا ہے

تڑپ اُٹھتے ہیں دل دم بھرنے کی طاقت نہیں کچھ ہے
دلِ بیتاب کو تسکین اک ساعت نہیں کچھ ہے
نظر آتی کوئی آرام کی صورت نہیں کچھ ہے
لکھا قسمت میں گویا اک دمِ راحت نہیں کچھ ہے

ہنر شد حالتِ قومی دریغا حسرتا دردا
بہ غفلت محوِ خوابِ ناز است ہر یک کشور ایشیا

حکومت پر ہی سب کچھ حصر رکھنا اک حماقت ہے
کھُلی راہِ ترقی ہے بڑھو گر تم میں ہمت ہے
بہت کچھ کام اپنے آپ کرنا درحقیقت ہے
سکھاتی صنعت و حرفت، زراعت اور تجارت ہے

بڑھے کیا دستکاری جبکہ عیب اس کو سمجھتے ہیں
خردمندِ جہاں تو [illegible] نہ عیب اس کو سمجھتے ہیں

آئی بار آور ہوا ب قلم کی یہ گل افشانی
یہ پژمردہ دلوں میں رنگ لائے سوزِ پنہانی
زمانہ قوم کے غم میں طبیعت کی ہو جولانی
یہی نازِ سخن گوئی یہی فخرِ سخندانی

کہ انداز سخن سازی گرہ از حال بکشاید
عجب رنگِ سخن باشد خموشی قال بنماید

کرم یاروں پہ اپنے اے مری تنہا کیے ہوں
خراب و خستہ دشمن سرخرو احباب تیرے ہوں
رعیت تیری شاداں ہو چمن شاداب تیرے ہوں
کلیہ رحم سے ہم پر کشادہ باب تیرے ہوں

ترے پرتو سے اس اندھیر میں پیدا اجالا ہو
ترا آفتاب روشن اے مری سرکار والا ہو

عجب کیا ہے جو تجھ سے آشنا اے سرکار ہو جائے
مری جانب سے حالِ قوم کا اظہار ہو جائے
توجہ سے تری ایسا یہ بیڑا پار ہو جائے
بھلائی کا تری جانب سے کچھ اقرار ہو جائے

امید پرورش ما راز تو وا کم بود شاہا
چرا از بحرِ لطفِ شیاں قائم بود شاہا

وطن کی ہو ترقی اور پھر وہ عزّ و شان دیکھیں
درِ گنجِ حمیت کا ہر اک کو پاسباں دیکھیں
ہر اک کو مردِ میداں کا اس وقتِ امتحاں دیکھیں
کہیں اپنا وہ اگلا جذبۂ دردِ نہاں دیکھیں

دوبارہ جاگ اٹھے بخت اس کشمیر بھومی کا
دوبارہ شوق سے سُن لیں ترانہ سازِ قومی کا

سخن ہو داستانِ جوشِ ہمت کی حکایت ہے
کریں اس پر عمل وہ گر تو یہ ان کی عنایت ہے
وطن کے پاں ثنا دل کے لیے اعلیٰ ہدایت ہے
مقامِ شکر ہو پھر بھی نہیں ہائے شکایت ہے

که گاہے گر کسے یک گوش دارد بر صدائے من
مثالِ نے برآوازہ شود تا ایں نوائے من

نہیں غم دل میں گر میٹھی مری باتیں سناں ہو کر
نہیں کچھ فکر گر اُٹھ جائے کوئی سرگراں ہو کر
جو ہمت ہو تو جیتو ہفتخواں کو ناتواں ہو کر
بنو تم جانِ عالم دو جہاں میں نیم جاں ہو کر

اُتر جاتی ہو دل میں قوم کے طالب صدا تیری
بھکاری قوم کا بن کر تو دیتا پھر یونہی پھیری

(۳)

قومی معشوق

(تضمین بر غزلِ سرور جہان آبادی)

۱۳، نومبر ۱۹۲۲ء ۔ مطبوعہ "صبح کشمیر" لاہور

جاذب و کشش کی تیری جہاں میں ہے گفتگو
بزمِ چمن میں قوم کی ہے تجھ سے آبرو
کھولے ہوئے ہوں عرصے سے آغوشِ آرزو
آ اے عروسِ حبِ وطن میرے بر میں تو
آنکھیں تری تلاش میں ہیں گرم جستجو

جب خوابِ ناز میں ہو تو آ کر جگاؤں میں
سازِ نیاز جذبۂ الفت بجاؤں میں
اتنی رکھائی خوب نہیں کیا جتاؤں میں
آ اے نگار تجھ کو گلے سے لگاؤں میں
آ مجھ سے ہمکنار ہو اے شوخِ خوش گلو

کاٹے ترے فراق میں ہیں تابکے ماہ و سال تیرے بغیر زندگی اب ہو گئی محال
ہے بے توجہی سی تیری کیا مجھے ملال وہ دن خدا کرے کہ سناؤں شبِ وصال
گردن ہو تیری اور مجھے دستِ آرزو

آ مجھ سے ہمکنار ہو اے میرے خوش جمال اب بیکسی میں طاقتِ برداشت ہے محال
جلدی کرے وہ دن مری قسمت ذو الجلال لپٹوں میں بیخودی میں تجھ سے شبِ وصال
باہیں ترے گلے میں ہوں لب پر یہ گفتگو

اُجڑے وہ دل نہ جس میں تری بود و باش ہو تو جس جگر کا سکھ نہ ہو وقفِ خراش ہو
جس سر میں تیری دھن نہیں وہ پاش پاش ہو ٹوٹیں وہ پاؤں جن کو نہ تیری تلاش ہو
پھوٹے وہ آنکھ جس کو نہ ہو تیری جستجو

بے خود غمِ محبتِ قومی میں تم رہو اس میں ہنسی خوشی جو مصیبت پڑے سہو
ہے لطف جب تباں سی نہیں دل لیے یہ ہو وہ گھر ہو بے چراغ جہاں تیری ضو نہ ہو
وہ دل ہو داغ جس میں نہ ہو تیری آرزو

حد سے فزوں اگر مجھے دردِ حبیب ہو آجائے موت پھر بھی جو تجھ سا طبیب ہو
تیرے سوا جہان میں نہ کوئی قریب ہو حوروں پہ میں مروں تو جہنم نصیب ہو
کافر ہوں میں جو مجھ کو بتوں کی ہو آرزو

دل میں ہر ایک کے ہو ترا عشق جاگزیں دہلیز پہ ہو تیری ہر اک کی جھکی جبیں
درسِ وفا ہو ہندو و مسلم کے دلنشیں ناقوس اور اذاں میں نہیں قیدِ کفر و دیں
اس کے لیے کہ جس کا پرستش کدہ ہے تو

غذلت پہ تیری مٹتے ہیں ہم زار زار رو ۔۔۔ ہاں ہاں خدا کے واسطے اب اور تو نہ سو
قربان تجھ پہ کرچکے ہم دھرم دین کو ۔۔۔ گنگا نہائے شیخ اگر تیرا اذن ہو
تیرا اشارہ ہو تو برہمن کرے وضو

رحمت تری جہان میں سامان ہی مرا ۔۔۔ الفت پہ تیری سر بھی تو قربان ہے مرا
تو وید میرا اور تو قرآن ہے مرا ۔۔۔ تیرا طریقِ عشق ہی ایمان ہے مرا
تیرے فدائیوں میں ہوں اے شوخ خوبرو

طالب کے ہو نہ دھیان احبا کا سامنے ۔۔۔ صحبت میں تیری غم نہ ہو فردا کا سامنے
نقشہ ہو تیرے باغِ تمنا کا سامنے ۔۔۔ جلوہ نہ ہو کسی مسِ رعنا کا سامنے
وہ دن خدا کرے کہ ہو آنکھوں میں تو ہی تو

(۴)

خطابِ قوم

۳۔ مارچ سنہ ۱۹۲۴ء کو راقم مشفقی پنڈت رامچندر صاحب ایم اے۔ بی ٹی لکچرار۔ انگریزی۔ ایس۔ پی کالج سری نگر کے ہاں بیٹھا ہوا تھا۔ پنڈت صاحب موصوف کشمیر کے ان ذہین۔ طباع اور بامروت اشخاص میں سے ہیں جنھوں نے اہلِ خطہ میں سے اوّل اول اعلٰے درجہ کی تعلیم پائی۔ آپ اپنے اعمالِ حسنہ کی بدولت کشمیر بھر میں نہایت ہر دلعزیز ہیں۔ علم ادب کا شوق اور شعر و سخن کا مذاقِ سلیم آپ میں کافی پایا جاتا ہے۔ انگریزی زبان کے مشہور

مصنفوں کے علاوہ آپ کو فارسی میں حافظ اور اردو میں غالب کا کلام اس قدر پسند ہے کہ اکثر احباب آپ کو حافظ پرست اور غالب پرست کہتے ہیں جب کبھی راقم ان کے پاس جاتا ہے شعر و سخن کے دوران تذکرہ میں اکثر اوقات دیوان حافظ میں سے غزلیں پڑھ کر سنانے کا ارشاد ہوتا ہے قوم کی ہمدردی اور ملکی خدمات کا سچا احساس بھی آپ کے دل میں بنہایت موجود ہے۔ اس روز قوم کی موجودہ حالت کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے ایک قومی نظم لکھنے کی فرمائش کی۔ ان دنوں راقم کا ادیب فاضل کے امتحان میں شامل ہونے کا ارادہ تھا۔ لہذا اردو کی میں ذیل کا مسدس لکھا۔ مگر چونکہ امتحان میں صرف ڈیڑھ مہینہ باقی رہ گیا تھا اور اس غرض سے لاہور جانا پڑا۔ یہ نظم ناتمام رہ گئی۔ اس کی تکمیل کا موقع بھی کبھی نہ آیا اور اسی طرح یہاں درج کی جاتی ہے۔ یہ مسدس ایک سال کے بعد "صبح کشمیر" لاہور میں بھی چھپ گیا تھا۔

* * *

اے قوم آج دردِ دل اپنا سناؤں گا
حالت پہ بیکسی کی توجہ دلاؤں گا
رو رو کے زار زار میں تجھ کو رلاؤں گا
نالوں سے اپنے عرش معلےٰ ہلاؤں گا

پیدا وہ ولولہ ہو دلِ بے قرار میں
اک ہوک اُٹھے درد کی جانِ نزار میں

افسانے شاعروں کے نہ باتیں ہیں خواب کی
شوخی کا ذکر اور نہ باتیں حجاب کی
بچپن کا کھیل ہے نہ ترنگیں شباب کی
رنگیں بیانیاں نہیں حسن المآب کی

واللہ اب وہ خبط نہیں ہے دماغ میں
پہلی چمک دمک نہیں اب اس چراغ میں

اے قوم سچ بتا کہ کدھر ہے کہاں ہے تو
اوجھل نظر سے ہو گئی کیوں ناگہاں ہے تو
پہلو تہی یہ کس لیے کیوں بدگمان ہے تو
للہ روٹھ جانا اگر مہرباں ہے تو

حال اپنا ہے زبوں تو ہیں آنکھیں بھی اشکبار
ہاں دیکھ لے نگاہ مروت سے ایک بار

اک وہ بھی دن تھا شان تری بے مثال تھی
ہر فن میں اور علم میں تو باکمال تھی
قوموں میں نونہال تھی فرخندہ فال تھی
نظروں میں اہل ہوش کی تو لازوال تھی

غفلت میں اور جہل میں اب لاجواب ہے
روداد تیری مرثیۂ انقلاب ہے

افسوس تجھ میں پہلا سا دم خم کہیں نہیں
گو اب وہ آسمان نہیں وہ زمیں نہیں
اپنے چلن کی بات تجھے دلنشیں نہیں
پستی کا تیری پھر بھی کسی کو یقیں نہیں

اپنے ہی شاد ہیں تجھے ناشاد دیکھ کر
آباد تجھ کو کہتے ہیں برباد دیکھ کر

جانباز جاں نثار وہ تیرے کدھر گئے
افراد قوم بگڑے کبھی اور سدھر گئے
زوروں پہ ولولے جو تھے کیوں وہ اتر گئے
لیکن مثال اختر گردوں بکھر گئے

صد حیف اب وہ شان وہ شوکت نہیں رہی
وہ تمکنت وہ جاہ وہ عزت نہیں رہی

بستی کا اپنی کچھ تجھے احساس ہی نہیں ۔۔۔ کشمیر کے گلوں میں وہ بو باس ہی نہیں
اٹھنے سنبھلنے کی تجھے کیا آس ہی نہیں ۔۔۔ اسلاف کے بھی نام کا کچھ پاس ہی نہیں

محفل کے کونے کونے میں جوش و خروش ہے
مانند شمع کشتہ تو ہی اک خموش ہے

جاگے ہیں غیر تو ہی فقط مست خواب ہے ۔۔۔ کیا صبح؟ سر پہ آ گیا اب آفتاب ہے
غفلت تمہاری تیری بھی کیا لاجواب ہے ۔۔۔ القصہ سونے والے کی حالت خراب ہے

اک کشمکش ہے تیری حیات و ممات میں
ہے ذکر ہست و نیست نشستن جہاں میں [?]

اے اہل قوم اٹھو کہ دم کاروبار ہے ۔۔۔ سوئے ہوؤں کا مردوں میں بھائی شمار ہے
دیکھو تو آنکھ کھول کے کیا حال زار ہے ۔۔۔ کس بات کا عزیزو تمہیں انتظار ہے

کب تک صدائے قوم کا دو گے نہ تم جواب
کب تک کیا کریں گے یونہی تم سے ہم خطاب

دھارمک نظمیں

سری کرشن چندر جی مہاراج کی یاد (1)

تقریباً ۲ [?] سال کا عرصہ ہوا کہ ایڈیٹر "سناتن دھرم پرچارک" امرتسر نے راقم کو ایک خط

لکھا جس میں اخبار کے خاص دکرشن، نمبر کے لیے مضامینِ نظم و نثر طلب فرمائیے ان دنوں عدیم الفرصت رہنے کے باعث اگرچہ میں ان کے حکم کی تعمیل کرنے سے قاصر تھا مگر بھگوان کی یاد اور مبارک جنم اشٹمی کا خیال دامنگیر ہوا اور اس نے مندرجۂ ذیل مسدس لکھنے پر آمادہ کیا - نہایت عذر و معذرت کے ساتھ ایڈیٹر صاحب کی خدمت میں بھیجدیا - اُنھوں نے نہایت مسرت کے ساتھ اسکو قبول فرمایا - بلکہ ایک لمبی چوڑی تمہید اس ہیچمداں کی تعریف میں خواہ مخواہ اخبار میں چھپوائی - جس کو یہاں نظرانداز کرتا ہوں - یہ مسدس اس سال کے کرشن نمبر میں شائع ہو کر مقبولِ عام ہوا تھا اگرچہ مجھے پھر بھی اس کے مختصر ہونے کا رنج ہے -

اے حسنِ طبع اپنی دکھادے بہار آج — اے کلکِ سحر کار ہو معجز نگار آج
لطفِ سخن ذرا تو طبیعت ابھار آج — ہاں اے زبانِ خامہ ہو گوہر نثار آج
ہر ایک شعر نکلے مرا یوں زبان سے
الماس جس چمک سے نکلتے ہیں کان سے

روشن سوادِ آج کی تحریر ہو مری — جس میں نہ ہو کلام وہ تقریر ہو مری
ہر ایک دل کے گوشے میں تاثیر ہو مری — موہن کی طرح موہنی تصویر ہو مری
تسکیں پذیر اس سے دلِ ناصبور ہو
آنکھوں کو اس سے نور ہو دل کو سرور ہو

لہ یہ نظم ۱۶ - اگست ۱۹۲۵ء کو مہاراجہ سر کشن پرشاد کی شانتی دھرم سبھا کے جلسے میں بھی پڑھکر سنائی گئی تھی - (طالب)

طرفہ سماں بہار کا چھایا ہو باغ میں — اک جوت ہو دہک رہی لالہ کے داغ میں
یوں بوئے یادِ شام سمائے دماغ میں — جیسے مئے شمیم ہو گل کے ایاغ میں

میرے کلیدِ شوق سے قفلِ دہن کھلے
اور دفترِ امید کا بابِ سخن کھلے

توصیفِ کشن میں ہو جس اوا مجھ سے بند چند — دل کو لبھائیں مدح کے اندازِ دلپسند
جو بات مُنہ سے نکلے ہو مثلِ نبات و قند — ہر دردمند دل کو پسند آئے بند بند

گلدستہ تازہ اک گلِ مضموں کا پیش ہو
تحفہ یہی قبولِ دلِ اہلِ کیش ہو

ہر سو مچی ہو دیکھنا کیسی یہ دھوم دھام — ہر صبح نورِ حسن ہی ہر شام دیدِ شام
عیش و طرب کا ہو رہا ہر سو ہی اہتمام — نکہت سے شادمانی کی بھرپور ہیں مشام

ہر جا ہے سنام پردہ قدرت میں جلوہ گر
جلوہ اُسی کا دیکھیے جائے جدھر نظر

کیوں غلغلہ خوشی کا نہ ہو آسمان میں — اوتار بن کے اُترا کنھیا جہان میں
یعنی وہ تو بند جو تھا لامکان میں — جلوے دکھائے اُس نے یہاں آکے تن میں

بہتر ہے جس کے فیض کے زیرِ نور ہے جہاں
آج اس کا چہرہ دیکھ کے مسرور ہے جہاں

وہ کرشن جس کے دم سے یہ قائم ہے کل جہاں — وہ کرشن جس سے سر کیں ملی ہے عز و شاں
وہ کرشن جو بالغ ہے ہر عقل تن میں جان — وہ کرشن جس سے کام ہیں دنیا کے سب رواں

اوتار بن کے آیا ہی دنیا کے واسطے
اہل جہاں کے دکھ کے مداوا کے واسطے

وہ ہادیٔ زمانہ وہ سرمایۂ جہاں
وہ مرشدِ یگانہ وہ اُستادِ قدسیاں
وہ زیب و زینِ کعبۂ دل نورِ لامکاں
چشم و چراغ ارض وہ سرتاج آسماں

درشن سے دور اس کے یہ سب ہوتے پاپ ہیں
انسان کے وجود میں جو لئے آپ ہیں

آنکھوں میں جلوہ فرما اُسی کا جمال ہے
کانوں کو بنسری کی صدا بے مثال ہے
گیتا میں پیارے کرشن کا ظاہر کمال ہے
مکھشا میں بے مثال ہے اور دیپ مثال ہے

دل چاہتا ہے اور بھی حالات کچھ لکھوں
پاسِ ادب ہی مقتضی اس کا کہ چپ رہوں

✲ ✲ ✲

۲

جنم اشٹمی

یہ ترکیب بند دراصل ۳- اگست ۱۹۱۶ء کو لکھا گیا تھا اور تقریباً ایک سال کے بعد سناتن دھرم سبھا لال سری نگر میں مبارک اُتسو جنم اشٹمی کے موقع پر پڑھا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد "سناتن دھرم پرچارک"، مرتبہ سردار "سناتن دھرم پرچارک" لاہور میں شائع ہوا۔

کھینچ لایا ہے یہ کس کا جذبۂ مستانہ آج
فیض سے کس کے کھلا ہے یہ درِ میخانہ آج

اس سبھا میں آئی اندر اس ہے کیا کوئی پری
دیکھیے جس کو جنونی سا ہے اور دیوانہ آج

اشتیاقِ دید ہے کس شمعِ بزمِ حسن کا
ہر بشر محفل میں آیا صورتِ پروانہ آج

کس کی تصویرِ تصور کی دلوں میں یاد ہے
کس کے لطفِ خاص سے معمور ہے کاشانہ آج

جادۂ الفت بنا ہے رشتۂ عہدِ وفا
ہے نرالا کس کا یہ اندازِ معشوقانہ آج

کس کی تعلیم و تعلّم سے مہذّب ہے جہاں
کس کی محفل میں ہوا دیوانہ بھی فرزانہ آج

ہے جنم دن کس کا جو ہے اس قدر جوش و خروش
آ رہا ہے جوشِ الفت دل میں بیتابا آج

شد عیاں رازِ نہاں در دیدۂ بیدار ما
آفریں صد آفریں بر بختِ برخوردار ما

مرحبا محبوبِ عالم! اے عزیزِ کل جہاں
تیری مدحت میں قلم قاصر ہے عاجز ہے زباں

تجھ سے ہے گلزارِ عالم میں بہارِ زندگی
ہے تجھی سے سر بسر یہ رونقِ باغِ جناں

تو نے بنیادِ محبت کو کیا تھا استوار
آج کل جس پہ نظر آتا ہے عالیشاں مکاں

ایک عالم ہے ترا گرویدۂ احسان و فیض
تجھ سے باقی ہے یہاں دردِ محبت کا نشاں

تیرے آنے سے اجالا ایک بیک پیدا ہوا
ظلمتِ بیگانگی تو نے مٹائی بے گماں

آگیا عالم میں بے شک لیکے تو پیغامِ حق
واہ وا کیسا مبارک خوشنما تھا وہ سماں

اہلِ عالم کو دکھایا تو نے اندازِ کمال
دستگیرِ بیکساں تھا چارہ سازِ ناتواں

یک نگاہِ لطف فرما باز تا بینم ترا
آئے در پرواز اے شہباز تا بینم ترا

پھر ترے دیدار کا ذوقِ تماشا ہے مجھے | پھر ترے انداز کا شوقِ تمنّا ہے مجھے
جلوہ گر پھر تجھ کو اس محفل میں ہوتے دیکھ لوں | دھیان درشن کا ترے رہ رہ کے آتا ہے مجھے
پھر وہی ہو میرے آگے جلوۂ دیدارِ کرشن | پھر مسرت خیز ذوقِ خاکِ متھرا ہے مجھے
پھر لگا ہوں میں ہماری حسرتِ دیدارِ شام | جس سے ہم آغوش ہونے کی تمنا ہے مجھے
پھر کنھیا جی کی آمد کا نظارہ دیکھ لوں | اس لیے مطلوب نورِ چشمِ بینا ہے مجھے
کاش اُٹھ جاتا حجابِ چشمِ غفلت میں پھر | آئے وہ درشن نظر جو روح افزا ہے مجھے
قلب ہے پہلو میں مضطر اور آنکھوں میں نظر | میرے ایشر شوق کا کیا کیا تقاضا ہے مجھے

اے سرورِ جاودانی اخترِ اوجِ کمال
کے شوقِ وصل یہ طالبِ منزلِ لطفِ وصال

—×∴×—

۳

سری کرشن لیلا

یہ مسدس کچھ عرصہ پہلے بھگوان کرشن کی یاد میں لکھا گیا تھا۔ "ایڈیٹر سناتن دھرم پرچارک امرتسر" کے اصرار پر ان کو بھیج دیا اور چند سال بعد کرشن نمبر میں درج ہو کر شائع ہوا

بہارِ دل کشا آئی ہوا بدلی گلستاں میں | نسیمِ روح پرور تازگی لائی رگِ جاں میں
فروغِ حسن کی ہے گرم بازاری پرستاں میں | ہوا دیوانگی کا زور پھر دشت و بیاباں میں
بنا رشکِ جناں ہندوستاں ہے حسنِ قدرت سے
نظر آتا ہے مالا مال سامانِ مسرت سے

بہارِ لالہ و گل ہی کھلی ہی نسترن کیا کیا
سجائی نرگس و ریحاں نے اپنی انجمن کیا کیا
دکھاتے ہیں نکھار اپنا صنوبر یا سمن کیا کیا
ہوئے ہیں محوِ آرائش حسینانِ چمن کیا کیا

تماشا سبز پریوں کا یہاں ایسا ہویدا ہی
کہ اندر اسن بھی وارفتہ ہی اس کا اور شیدا ہی

عیاں ہی گلبنوں سی کیا شبابِ حسنِ نورانی
بنا ہی لالہ کشمیر اب لعلِ بدخشانی
نہاں ہی سروِ رعنا میں قدِ موزوں کی جانانی
یہ منظر دیکھ کر افزوں ہوئی نرگس کی حیرانی

لباس نو پہنکر نوجوانانِ چمن آئے
ترانے تہنیت کے اور مبارکباد کے گائے

بنا ہی صفحۂ قرطاس مثلِ وادیِ ایمن
طبیعت نے کھلائے گل مثالِ نرگس و سوسن
قلم میرا عصائے موسوی ہی علم کا مخزن
ہر اک مصرعہ بنا سروِ روانِ زینتِ گلشن

بجا ہی فخرِ مضمونِ ثنا جو آج اپنا ہے
کہ یادِ شام میں لکھا ہی جو سرتاج ابا ہی

ہمیں بھگوان اپنی مہر سے درشن دکھائینگے
دوبارہ شوق سے ابدیش گیتا کا سنائینگے
ادا سے آن سے پھر ناز سے مرلی بجائینگے
گناہ اور جہل سے پھر اہلِ عالم کو بچائینگے

بچشمِ شوق ہم دیکھیں نمونہ اس کی قدرت کا
سمائے آنکھ میں رتبہ خداوندِ حقیقت کا

ہوا تھا جن کے نورِ جبہ سے آکاش نورانی
حقیقت آشنا وہ واقفِ اسرارِ پنہانی
چھڑائی نفسِ امارہ سے دل جس کی مہربانی
ہزاروں پا گئے برکت سے جس کی فیضِ روحانی

جنم دن آج اس محبوبِ عالم کا مناتے ہیں
جہاں سے پردۂ باطل کی ظلمت کو مٹاتے ہیں

قلم کو روک لے طالب بہت ہی سخت منزل ہے
تیری اس نغز گفتاری سے ظاہر مقصدِ دل ہے
یہ مانا اس جہاں میں تو بھی اک استادِ کامل ہے
ثنائے کرشن لیکن ہو ادا تجھ سے یہ مشکل ہے

یہی اک نام تیرے لب پہ صبح و شام جاری ہے
تو حالت پر تری لطف و عطائے شام جاری ہے

۳

یادِ شام

۹۔ اگست ۱۹۱۵ء۔ مطبوعہ "سناتن دھرم پرچارک" امرتسر

کشن کے درشن کا تھا آنکھوں کو میری انتظار
دل مرا ابر میں نہاں تھا مضطر اور بیقرار
تھا اسی عالم میں نکلا جا کے سوئے کوہسار
پاس تھا اک باغ جس میں تھی بہار رنگی قطار
اس کا آبِ صاف امرت سے کہیں تھا خوشگوار
تھا زمرد سے زیادہ اس کا دلکش سبزہ زار
مثلِ حسنِ سبز دامنگیر تھا ہر نوکِ خار
دل نے چاہا کیجئے اس جا پہ جان و دل نثار
کیا بتاؤں کیا کھلا تھا اس جگہ باغِ نشاط
صاف تھے اس کے پھول پتے پر تھی سب جاں نثار
گل وہاں بے خار تھا۔ بلبل تھی بے آہ و فغاں
سینہ لالہ کا نہ تھا رنجِ خزاں سے داغدار
آنکھ نرگس کی کھلی تھی اور سوسن کی زبان
تھا وہاں لطفِ بیاں۔ نورِ بصیرت آشکار
اک طرف تھے نوجوانانِ چمن یوں جھومتے
اینڈتا ہو جیسے میخانہ میں کوئی بادہ خوار

فرشِ مخمل سے بھی بڑھ کر سبزہ خوابیدہ تھا
طبعِ شاعر رنگ لائی یہ نظارہ دیکھ کر
ابرِ نیساں جس طرح برسائے موتی بحر پر
مثلِ موسیٰ یہ جگہ میرے لیے تھی کوہِ طور
کیا کہوں گردھر وہاں کس طرح پھر مجھ سے ملے
اک تماشا ایسی حالت میں مجھے آیا نظر
پیاری صورت موہنی مورت تھی میرے سامنے

راجہ اندر کا اکھاڑا تھا بنا ہر لالہ زار
جس کا تھا میں مدتوں سے منتظر امیدوار
بس یونہی ہونے لگے موزوں یہ شعرِ آبدار
میں بحالِ بے خودی غش ہو گیا بے اختیار
جس طرح بادل سے سورج ہو یکایک آشکار
جس کے ہی اظہار سے داماں قلم کا زار زار
تھے لٹکتے جس کی گردن میں ہنسلیوں کے ہار

جلوہ گر چوں گشت آں حسنِ ازل در پیش رو
میشدم غالب بالگردانِ او در بین گفتگو

کیا سبب ہے کیوں تو اے آرامِ جاں ملتا نہیں
دو گھڑی کو بھی ذرا اے مہرباں ملتا نہیں
میری نظروں سے یکایک کیوں تو پنہاں ہو گیا
کیا خطا مجھ سے ہوئی کیوں جانِ جاں ملتا نہیں
بستیٔ دنیا خانۂ ویراں بنی تیرے بغیر
خاک چھانی آہ! زیرِ آسماں ملتا نہیں
ہم کریں سجدہ کیسے جب تو نہ ہو پیشِ نظر
تیرے دروازے کا سنگِ آستاں ملتا نہیں
چل کے بندرابن میں ڈھونڈوں گا تجھ کو کس طرح میں
گوکل و متھرا میں بھی تیرا نشاں ملتا نہیں

برج سے بیزار کیوں مرلی منوہر ہو گئے
بنسری کا جو پتا ہم کو یہاں ملتا نہیں

سنتے آئے منزلِ مقصود کی نسبت بہت
ہائے کچھ ہم کو سراغِ کارواں ملتا نہیں

اُڑتے اُڑتے طاقتِ پرواز زائل ہو گئی
سیرِ گلشن اس قدر کی آشیاں ملتا نہیں

اب نہ تجھ کو رن میں لڑتے دیکھتے ہیں ہم کبھی
اور گیتا کا سبق ہم کو یہاں ملتا نہیں

چشمِ روحانی میں اپنی کچھ بھی بینائی نہیں
اس لیے شاید کوئی تیرا امکاں ملتا نہیں

راس منڈل کا تماشہ ہائے کیوں مفقود ہے
کیوں وہ اب اپنا سرودِ جاوداں ملتا نہیں

یک بیک پنہاں ہوا ہے تو نگاہِ شوق سے
دیدۂ بینا تجھے تیرا نشاں ملتا نہیں

چھا گئی بادِ خزاں اب گلستانِ ہند پر
کوئی اس اجڑے چمن کو باغباں ملتا نہیں

چھوڑ کر دامانِ رحمت تیرا ہم جائیں کدھر
کوئی تجھ سا مہرباں اے مہرباں ملتا نہیں

تو تو موصوفِ صفاتِ نیک الحق ہی مگر
مدح کا تیری ہمیں رنگِ بیاں ملتا نہیں

طالب اس کے وصف میں اس طرح جب گویا ہوا
تو وہ بولا یوں کہ منہ امرت سے نہا دھویا ہوا

میں مہیا گل میں ہر بوٹے میں ہر گلشن میں ہوں
ہوں تبسم میں کلی کے مرغ کے شیون میں ہوں

میں ہی باغِ دہر میں ہوں بلبلِ شیریں نوا
ہوں میں ٹھنڈک باغ میں اور گرمیاں گلخن میں ہوں

قعرِ دریا میں ہوں ظاہر صورتِ تحت الثرےٰ
زینتِ عرشِ معلےٰ ہوں ہر اک مسکن میں ہوں

ناز بن کر ہوں اداؤں میں لبروں کی جلوہ گر
بن کے سوزِ عشق میں عاشق کے جان و تن میں ہوں

گلشنِ ہستی بھی ہے میری مہک سے عطر بیز
بر سرِ گورِ غریباں خامشی سوسن میں ہوں

گوپیوں سے پھر میں کرتا ہوں وہی اٹھکھیلیاں
گوکل و متھرا میں بھی ہوں اور بندرابن میں ہوں

مہ بن کے شب کو ہوا ہوں آفتابِ نیم روز
بہر کسبِ نور جذبِ آسمانِ روشن میں ہوں

خاکساری سے جھکاتا سر ہوں گھاٹ گھاٹ
پردۂ بیرنگ بن کر چشم و دامن میں ہوں

وحشتِ غربت وادیِ ایمن میں ہے مسکن میرا
بن کے موسےٰ بر سرِ فرعون پیدا رن میں ہوں

رام لچھمن اور سیتا سارے ہیں میرے سروپ
میں ہی بن کے کبر و نخوت صورتِ راون میں ہوں

کثرتِ عالم میں وحدت اور مکاں میں لامکاں
مثلِ رنگ و بو عیاں پنہاں ہر اک گلشن میں ہوں

کون کہتا ہے کہ میں ہوں عرش پر ہی جلوہ گر
ذرے ذرے میں نمایاں کثرتِ خرمن میں ہوں

دوست بن کر گاہ آتا ہوں تمہارے پاس میں
بھاگنا میں تم سے گاہے صورتِ دشمن میں ہوں

مثلِ کوکب رہنما گلہے شبِ تاریک میں
اور سلوکِ معرفت میں صورتِ رہزن میں ہوں

شمع ساں یکساں ہوں روشن کعبہ و بتخانہ میں
شیخ کے دل میں ہوں جو وہ برہمن کے من میں ہوں

بولتا دل بر میں ہی پر گوش شنوا چاہیئے
"عشق کیا شی ہی کسی عاشق سے پوچھا چاہیئے"

۵

ہولی کی بہار

منشی رام سہائے صاحب تمنا لکھنوی ہر سال اپنے رسالہ "دربار" لکھنؤ کا ہولی نمبر شایع کرتے تھے۔ نیاز مند سے بھی ایک مرتبہ ہولی کی تقریب پر ایک نظم طلب فرمائی۔ کشمیر میں اس تہوار کا اتنا چرچا نہیں جتنا کہ ہندوستان میں ہی۔ یہی وجہ ہی کہ ہولی کی شان میں راقم نے فقط یہی ایک غزل لکھی ہی۔ اور وہ بھی ایڈیٹر صاحب کے طلب کرنے سے پہلے ہی اپنے ایک پنجابی دوست کی فرمایش کی تعمیل میں ۳ دسمبر ۱۹۱۶ء کو کہی تھی۔ اور تقریباً دو سال کے بعد رسالہ مذکور میں طبع ہوئی۔

رنگ لیاں برج میں پھر آشکارا دیکھ لوں
کشن جی کو کھیلتے ہولی دوبارا دیکھ لوں

بھول جائے بلبل و گل کا بھی ناز و نیاز
برج بھومی گر نظارہ میں تمہارا دیکھ لوں

کرشن کی لیلا میں دیکھوں جلوۂ نورِ خدا
ابر کے پردے میں ظاہر ماہ پارا دیکھ لوں

سرد مہری سے جہاں کی گرم بازاری ہی سرد
آتشِ الفت کا روشن پھر شرارا دیکھ لوں

جبکہ آخر وقت میں ہونگی اُمیدیں قطع سب
کشن جی کو اپنے آگے جلوہ آرا دیکھ لوں

نام سے جس شیام کے بیڑا ہمارا پار ہو
گوپیوں میں جلوہ گر پھر وہ دل آرا دیکھ لوں

رنگ رلیوں میں کٹی طالب ہی ہولی کی بہار
محفلِ عشرت میں وہ آنکھوں کا تارا دیکھ لوں

(۶)

پرمہنس سری رام کرشن جی کی برسی

ڈاکٹر سری رام صاحب جو اپنی خدمات اور نیک دلی کی وجہ سے نزدیک و دور مشہور ہیں اور کم از کم کشمیر میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ قریب نو سال سے راقم کے واقفوں میں سے ہیں۔ آپ جس وقت سے کشمیر میں بہ سلسلۂ ملازمت وارد ہوئے ایک سچے خادمِ ملک بن کر ہر قسم کے سوشل اور ہمدردانہ کام میں برابر حصہ لیتے رہے۔ بلکہ عام معلومات میں دلچسپی لینے کے علاوہ ملک میں جابجا ریڈنگ روم اور کتب خانوں کی بنیاد ڈالدی۔ چنانچہ رعناواڑی میں ایک ریڈنگ روم اور کتب خانہ سری رام کرشن جی پرمہنس کی یادگار میں قائم کرایا۔ اس کے علاوہ پرمہنس جی کی برسی کا مبارک اُتسو بھی ہر سال کافی شان اور دھوم سے مناتے رہے ۱۹۱۸ء کی برسی پر راقم سے بھی ایک نظم لکھنے کی فرمائش کی۔ اول تو ہر شخص ڈاکٹر صاحب کے اخلاق۔ قومی جوش اور صداقت قلبی کی وجہ سے ان کا ایسا گرویدہ احسان ہو جاتا ہے کہ ممکن نہیں کہ کوئی اُن کے ارشاد کی تعمیل کرنے سے انکار کرے اور پھر اس پر پرمہنس جی سوامی ویویکانند اور سوامی رام تیرتھ جی کی جیسی پاک ہستیوں کی نسبت کچھ نہ کچھ لکھنے میں کس کو تامل ہو سکتا ہے۔ ذیل کا مخمس اسی جلسے

کی ادا کی ہی - اس موقع پر مولوی امیرالدین صاحب امیر کاشمیری نے بھی ایک مخمس
سُنا کر حاضرین کو محظوظ کیا۔

محفل میں آج ہوتا ہی کون جلوہ آرا چرخ وطن پہ چمکا ہی کونسا ستارا
طبع رسا ہی کرتی کس بات کا اشارا سینے میں دل کو کس نے ہی جوش کا اُبھارا
پیش نظر ہی کیسا آنند کا نظارا

جوبن پہ آگیا ہی کیا رنگ گلستانی سرسبز پتا پتا گل سب ہیں ارغوانی
بزم چمن کی رنگت جس کا نہیں ہی ثانی فردوس اس کے آگے ہوتا ہی پانی پانی
ہر ایک سروقد نے اپنے کو ہی سنوارا

کیسا نرالا جلسہ ایجاد ہو رہا ہے جو سرو ہی چمن میں آزاد ہو رہا ہی
تمشاد خرمی سے دلشاد ہو رہا ہے کاشانۂ محبت آباد ہو رہا ہی
خوش آمدید دل سے ہر اک نے پکارا

پھولا ہوا ہی ہر گل کشمیر کے چمن کا ہی جا بجا تماشا نسرین و نسترن کا
ہی رشک مہر ذرہ اس وادیٔ کہن کا ہر اک بشر بنا ہی غنچہ خوشی کا مُنکا
عیش و خوشی کا بجتا ہے زور سے نقارا

ہر سو ہی شادمانی اک تسو ہی جہاں میں عشرت دل کمیر میں و عیش ہی مکاں میں
ہندوستاں میں جلسے اس دورۂ زماں میں کیوں ولولہ نہ پیدا ہو آج آسماں میں

لہ زمانۂ جنگ جرمن کی طرف اشارہ ہی (طالب)

پیدا ہی آج ہوتا جو رام کشن پیارا

آغوشِ فضل جس کا دریائے بیکراں ہی — قربانیوں سے اپنی جو زندہ جاوداں ہے
اہلِ صفا کے دِل پر ہر وقت حکمراں ہی — عظمت میں جس کی ہرگز کوئی نہیں گماں ہے

پستی سے جس نے آکر ہر ایک کو اُبھارا

جیون کا واقعہ اک انکی ہی یاد آیا — خدمت کا جس میں مطلب ہے آپنے بتایا
لمبے کٹھن سفر سے دکھ تھا بہت اُٹھایا — تکلیف تھی بدن کو اور بھوک نے ستایا

چلنے کی گفتگو کی تھی تاب اور نہ یارا

اتنے میں ان کے آگے آیا تھا ایک چیلا — جو ہاتھ باندھے چپکا تعظیم سے کھڑا تھا
غمگیں تھا درد دل سے چہرہ اُداس سا تھا — بولے وہ شانتی سے کیوں خیر تو ہی بابا

بے چین کس لیے ہی دل ہو رہا تمہارا

دلسوزیوں کی جاں تھا چیلا وہ من کا بھولا — اوّل تو اُس نے اپنا منہ شرم سے نہ کھولا
کہنے سے پہلے اس نے اپنے سخن کو تولا — دل پر وہ آخر اپنے یوں ضبط کرکے بولا

گاؤں میں پاس کے ہی بیمار اک بچارا

بیکس پڑا ہوا ہی جاں سے گذرنے والا — بچنے کی آس کم ہی شاید ہی مرنے والا
تیماردار بن کر دم اس کا بھرنے والا — کوئی نہیں ہی ایسا احسان کرنے والا

کندھوں پہ میرے اس کو رکھ کر جو دے سہارا

لیجاتا اُس کو گھر میں کرتا میں اس کی خدمت — کم ہوتی جس سے اُس کی تکلیف اور مصیبت
ہو جاتی رفع اس کی جو کچھ کہ ہو ضرورت — اے کاش میں دکھاتا ہمدردی و محبت

تکلیف سے ہی اُس کی دل میرا پارا پارا

یہ سُننے پر وہ بولے شاباش میرے پیارے — ایسی ملے جو سیوا دھن بھاگ ہیں ہمارے
اٹھو کہ ساتھ چلتا ہوں میں ابھی تمہارے — ایسا نہ ہو وہ دُکھ میں پڑ لوک کو سدھارے
اس کارِ خیر میں کیا کرنا ہے استخارا

ہر چند تھا یہ چیلا ایسی مدد کا قائل — منظور تھا نہ ہرگز اس کو کہ ہو وہ مائل
لیکن دوئی کا پردہ ان میں جو تھا نہ حائل — ہمراہ ہونے کے خود بس ہو گئے وہ سائل
ویسے ہی جا کے فوراً خود دے دیا سہارا

بگڑی دشا وطن کی تھی سر بسر ہمارے — برباد ہو رہے تھے دکھوں سے گھر ہمارے
ہوں عیش میں نہ کیونکر دن اب بسر ہمارے — امداد وقت پر کی اے راہبر ہمارے
مدّاح تیرا ہر اک ریفارمر ہمارا

اے صاحبِ مروّت اے بادشاہِ ہمت — طرزِ عمل سے تیرے ظاہر ہے تیری قدرت
ہم سے ترے ہوئی تھی بہبودِ ملک و ملّت — تو نے پلایا ہم کو وحدت کا جامِ اُلفت
بگڑے ہوؤں کو تو نے کس کس طرح سنوارا

تیری عنایتوں سے اکثر ہوئے ہیں نامی — گمنامیوں کو بخشی کیا شہرتِ دوامی
ہمدردِ اہلِ عالم دُنیا و دیں کا حامی — احسان تیرے ہم پر ہیں بے شمار سوامی
گمراہ جو ہوئے تھے دم میں انہیں سدھارا

ایثار کا طریقہ ہم کو سکھایا تو نے — مکتی کا کیسا سیدھا رستہ بتایا تو نے
انسانیت کا سچّا جلوہ دکھایا تو نے — وحدانیت کا کیسا شُدھ راگ گایا تو نے
دشمن کا دوست بننا ہر جا تھا آشکارا

اے باہرِ حقیقت اے اوجِ بامِ عالی — اے رازدارِ الفت اے سالکوں کے والی
آنند اور سکھ سے یہ ملک اب ہی خالی — طالب ترا ہی تجھ سے اس بات کا سوالی
او عزّ و شان والے آجا یہاں دوبارا

کنھیا کا دھیان

۵۔ اگست ۱۹۱۶ء۔ مطبوعہ سناتن دھرم پرچارک "امرتسر"

تھی تمنا شام کے دیدار کی ہر صبح و شام — میں کنارِ جو بنا اک دن تھا مصروفِ خرام
اک طرف تھی چادرِ گل اک طرف آبِ رواں — اک طرف نرگس کی آنکھیں اک طرف لالے کے جام
باغ دلکش تھا وہاں یا دلربا دیوانِ خاص — تھا طیورِ خوشنوا کا جس میں اک اجلاس عام
کرتی تھی تازہ نسیمِ جانفزا ہر روح کو — تھی مہک سے اس کی ہر موجِ صبا روحِ مشام
گلشنِ عیش و طرب میں تھی بپا بزمِ نشاط — تھا کبھی ساغر کا ذکر اور تھی کبھی یادِ طعام
جس کو دیکھو مست تھا اپنے سرود و ساز میں — چل رہا تھا بے غل و غش بادۂ مستی کا جام
دلخراش اس میں مگر اک سین آتا تھا نظر — ہوئے جس سے دکھی تھے نالۂ غم انام
سایہ افگن تھا لبِ جو اک درختِ کہنہ سال — نذر کی تھا جو اپنی قوم کا جلسے تباہ
اس قدر بالا تھی اس کی رفعتِ قدِ دراز — دیکھنے کے وقت لینا پڑتا تھا پگڑی کو تھام
ہائے لیکن اس کی اگلی شان اب باقی نہ تھی — اڑ گئی تھی تازگی سرسبزی و رونق تمام
ٹہنیوں پر نغمہ زن اس کی کوئی طائر نہ تھا — مردنی سی چھا رہی تھی اس شجر پر لاکلام

عظمتِ دیرینہ اس کی تھی مگر دیتی پتا
واقعی تھا اِک زمانہ میں بلند اس کا مقام
سارے گلشن ہی میں تھا اک خزاں دیدہ شجر
دیکھا تھا چشمِ عبرت سے جسے ہر خاص و عام

حضرتِ طالب اسیرِ حیرتِ ایں حال گشت
سوئے تحقیقاتِ ایں طبعش بہ استعجال گشت

دل میں خواہش تھی کہ ہوں ہمراز اس کا ہمزباں
اور گوشِ ہوش سے سن لوں میں اس کی داستاں
یہ خیالِ خام سمجھا تھا جنوں سے بھی سوا
دل میں ارماں تھے مرے اور اس میں باقی تھی نہ جاں
پھر رہا تھا میں اسی دھن میں وہاں دیوانہ وار
غرقِ بحرِ فکر تھا گو بند تھی میری زباں
منتظر رہ کر بہ آخر یوں زبانِ حال سے
چپکے چپکے اس سے تھا گویا طلبگارِ بیاں
میں نے پوچھا باعثِ عظمت تھا تیرا کیا رفیق ؟
کس طرح بڑھنے لگی تھی تیری شاخِ عز و شاں
مل گئی تھی تجھ کو ایسی سرفرازی کس طرح ؟
رکھ سکا محفوظ کیونکر تجھ کو یہ دورِ زماں
پائی تھیں تو نے قدِ موزوں کی کیا رعنائیاں ؟
اور تو کیونکر بنا تھا زینتِ باغِ جہاں
اب یہ کھو بیٹھا ہے تو کیوں یک قلم جاہ و جلال ؟
اب جوانانِ شجر میں تیری سرداری کہاں
پائی تھی کیا پرورش تو نے تباہی کے لیے ؟
تجھ پہ جو عائد ہوئی ہیں اس قدر بربادیاں
رہ گیا تو کیوں اکیلا اس طرح اس حال میں ؟
جبکہ ہو خوش حال باقی کارواں کا کارواں
جی کڑھاتی ہے مری از بس یہ خاموشی تری
ملتجی ہوتا ہوں تجھ سے کھول دے اپنی زباں
تیری خاموشی سمندِ شوق کو مہمیز ہے
اب تو ہوتی جاتی ہیں بے قابو مری بیتابیاں
سرگذشت اور حال اپنا کچھ بیاں آخر تو کر
کر چکا ہے کیوں تجھے برباد جورِ آسماں

گفتہ گفتہ طالبِ احوال چوں خاموش شد
از زبانِ حال با اظہار ہم آغوش شد

یاس مانع ہی کہاں سے آئے تابِ ذکرِ حال
بعدِ مدت بیکسی میری نظر آئی تھیں
آرزوئے لب کشائی اب نہیں باقی مجھے
اِک زمانہ تھا کہ اکثر یار اور احباب تھے
حالتِ اُفتادگی اب ان کو آئی ہی پسند
دھرم کا جن کو خیالِ نیک ہتا تھا مدام
برق مجھ پر ما دّیت کی گری وہ غرب سے
یک بیک چھائی گھٹا ادبار کی چاروں طرف
باغباں بس ایک وہ مرلی منوہر ہی مرا
حسبِ وعدہ کام آئینگے وہ اٹّے وقت میں
ہو عمل میرا اگر بھگوت کی گیتا پہ جہاں
ماجرا یہ سُن کے دل میرا ہوا حیران سخت
عقل نے لیکن سنبھالا ہوش جلدی پھر مرا

کرتا ہی تحریکِ خاموشی تمہارا یہ سوال
چشمِ ہمدردی سے دیکھا تم نے آکر میرا حال
پوچھتا ہی کون میرا باعثِ رنج و ملال
جو کھلے دل سے لٹاتے مجھ پہ اپنا جان و مال
جن کو خواہش تھی کہ حاصل ہو مجھے اوجِ کمال
کرشن کی گیتا کے قولوں پہ چلے بے قیل و قال
اب نہ وہ نامِ عبادت ہے نہ وہ تابِ جمال
اب کسی کو بھی نہیں میرے سدھرنے کا خیال
جس کے ہاتھوں رہ سکوں محفوظ مثلِ قوتِ دال
شرط ہی آکے کرے کوئی مگر دستِ سوال
پھر وہی حالت ہو اگلی سی وہ حاصل ہو کمال
کیا ہی یہ رودادِ اور کس کی ہی یہ پُر درد حال
اور دل پر سے اُٹھا یا میری حیرانی کا جال

آں خزاں دیدہ درخت ایں اوفی کشمیر بود
خواب ما دیدیم طالب حاصلش تعبیر بود

•••

رامائن کا دلکش سین[۵]

نمبر ۱

۳- اپریل ۱۹۱۳ء - غیر مطبوعہ

سری رامچندرجی مہاراج کے بن باس جانے پر ماتا کوشلیا سے ان کی گفتگو

کوشلیا ماتا

گھر میں اے لختِ جگر تجھ بن تباہی کیوں نہ ہو؟ — باعثِ رنج والم تیری جدائی کیوں نہ ہو؟
تو نہ مانے بات میری ہائے بیٹے کیا غضب — میرے پیارے اس میں تیری جگ ہنسائی کیوں نہ ہو؟
تیری فرقت میں مجھے راحت ہو حاصل کس طرح؟ — تجھ کو بن میں جانے کی گو دھن سمائی کیوں نہ ہو؟
ہے مقدم حکم ماتا کا یہ سن نورِ نظر — ٹالنے میں اس کے عائد سو برائی کیوں نہ ہو؟

رامچندرجی

کاتبِ تقدیر کی ثابت صداقت ہے یہی	گر نہ جاؤں بن کو تو وجہِ ندامت ہے یہی
سلطنت سارے جہاں کی بھی ملے تو خاک ہے	باپ کی فرماں پذیری اور اطاعت ہے یہی
گر بچن کا پاس ہے تو چیز کیا بن باس ہے	عزم بے وسواس ہے بیشک سعادت ہے یہی
پیاری ماتا میں پتا کا حکم مانوں گا ضرور	سچ میں کہتا ہوں گرو جی کی نصیحت ہے یہی

کوشلیا - ماتا

یہ سُنانی سُن کے تیری ماں تو لرزاں ہو گئی	جو تری بدخواہ تھی وہ آج شاداں ہو گئی
راج کو کر لے بھرت ہی اے مرے نورِ بصر	میں جدائی سے تری لیکن پریشاں ہو گئی
کس طرح تیرا جدا ہونا گوارا ہو مجھے	میرے دل کے چین ماتا تجھ پہ قرباں ہو گئی
دور کر دل سے دُلارے بن کو جانے کا خیال	تیری عزت ہر دو عالم میں نمایاں ہو گئی

رامچندر جی

بس سمجھتا ہوں مرے بن باس سے غم ہیں بہت	تم تو ماتا ہو رعایا کو بھی ماتم ہیں بہت
قید میں ہوتی ہیں جو تکلیفیں اور ملتا ہے دکھ	اس جلا وطنی کے دکھ کے آگے وہ کم ہیں بہت
لیکن اے ماتا ہو جس کا دل سمندر پریم کا	اس کے جنگل میں بھی مونس اور ہمدم ہیں بہت
باپ کے ارشاد کی تعمیل کو سب پر ہے فوق	سر پہ انسانوں کے یوں تو فرض پیہم ہیں بہت

کوشلیا ماتا

جنگلوں میں جاکے دل کو دکھ میں ڈالا چاہیے	اور زیبِ تن تمہارے مرگ چھالا چاہیے

اس تن نازک کو کیونکر آئیگی کانٹوں پہ نیند ہاتھ میں جنکے کو سمرن اور مالا چاہیئے
تانہ ہو تم کو درندوں کا وہاں خوف و خطر دوش پر تیر و کماں ہاتھوں میں بھالا چاہیئے
مجھ کو اے نور نظر تیری جدائی شاق ہے گوسنیلی کا تری یوں بول بالا چاہیئے

رامچندر جی

٦ پیاری ماتا تجھ کو دکھ سے خونفشانی کیوں ہو چہرہ اس صدمے سے تیرا زعفرانی کیوں ہو
کیکئی راجہ کی پیاری رام ہے فرماں پذیر حکم مانوں میں نہ بدظن مجھ سے رانی کیوں ہو
ہے نہ چاہت راج کی خواہش نہیں ہے تاج کی بار آور پھر مرا نخل جوانی کیوں ہو
میں نہ مانوں حکم ہوگا کون مجھ سا بد نصیب ہائے بدنامی ہماری خاندانی کیوں ہو

کوشلیا ماتا

فخر ہے بھارت کا تو تجھ میں اطاعت ہے ضرور آگیا کی پالنا میں استقامت ہے ضرور
جب تلک اس آکاش پر روشن ہیں مہر و قمر یادگاری تعلق کی تیرے عظمت ہے ضرور
چھپاؤں گی چودہ برس فرقت اگر زندہ رہی گو مرا دل چاک ہے اور سر میں وحشت ہے ضرور
جبر سے دل پر کرونگی صبر بیٹھوں گی خموش گو مرے چہرے سے روشن تو حقیقت ہے ضرور

رامچندر جی

بن میں جانے کے لیے سب اب تو ساماں ہو گیا منزل مقصود اب مجھ کو بیاباں ہو گیا
راج کرنے میں بھرت کے لطف ہے حاصل مجھے ایسا راجا اپنی پرجا کا نگہباں ہو گیا

کہتا ہوں دل کی خوشی سے دوستوں کو خیرباد	فرقتِ احباب سے گو دل پریشاں ہو گیا
وصل کی امید پر دردِ جدائی سے ہوں شاد	ورنہ میں حکمِ پدر پر اپنے قرباں ہو گیا

خاتمہ

رام اور ماتا کا جو آپس میں یہ سمواد ہے	قابل صد آفریں ہے اور مبارکباد ہے
جو کرے دل سے پتا ماتا کے حکموں کو قبول	دیوتاؤں کا عمل پر اس کے حرف صاد ہے
ہند کے سارے دلاور دھرم پر قربان ہیں	رامجی ان کا گروہی پیر ہے اُستاد ہے

غور سے پڑھنے کے لایق ہے یہ طالب داستاں
دیکھو رامائن میں کیا کیا رام کا ارشاد ہے

۹

گئو ماتا کی فریاد

مارچ ۱۹۱۰ء کی تیسری تاریخ کی رات کو راقم نے ایک خواب دیکھا کہ ایک وسیع اور خوشنما باغ ہے جس کی ایک حد پر ایک چھوٹا سا مکان واقع تھا۔ باغ میں ایک آدمی ایک چھوٹی اور خوبصورت گائے کے گلے میں رسی ڈال کر اس کو پکڑ کر کہیں لے جا رہا تھا اور دوسرا اس کے پیچھے پیچھے اس کو لاٹھی سے ہانک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی مرضی کے خلاف کسی خاص جگہ کی طرف کھینچے لئے جا رہے تھے۔ دوسرے دن ابھی اس خواب کی یاد تازہ ہی تھی کہ قریب دس بجے

صبح کے چند احباب آئے اور چشمہ شاہی کی سیر کو جانے کی تجویز قرار پائی۔ چنانچہ گیارہ بجے کے قریب سب گھر سے چل پڑے اتفاق ایسا ہوا کہ راستہ میں ایک مقام پر ایک خستہ حال گائے گھاس چرتی ہوئی نظر پڑی۔ دل پر ایک چوٹ لگی اور خواب کا سماں آنکھوں میں پھر گیا۔ اپنے ہمراہیوں سے بھی اس کا ذکر کر کے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ ہمارے والیٔ ملک مہاراجہ صاحب بہادر تو گئو رکھشا میں عدیم المثال ہیں۔ لیکن ہم لوگ ہی اس بارے میں اپنا فرض انجام نہیں دیتے وہ بھی اس سے متاثر ہوئے لیکن اپنی مجبوری ظاہر کی۔ راقم نے کہا دل میں آتا ہے کہ اس واقعہ پر ایک نظم لکھوں فرمایا۔ ہاں ضرور! کم از کم اتنا تو ہو۔ شاید ایسی نظم سے کسی نہ کسی کے دل میں گئو رکھشا کا احساس پیدا ہو۔ چنانچہ اسی شام کو ذیل کی نظم لکھی تقریباً ڈھائی سال کے بعد ایڈیٹر سناتن دھرم پرچارک امرتسر نے گوپال اشٹمی نمبر کے لیے اسی مضمون کی ایک نظم طلب فرمائی۔ چونکہ یہ نظم اس وقت تک طبع نہ ہوئی تھی بھیج دی اور شایع ہوئی۔

اک دن جو شرقِ سیر مرا راہبر ہوا
وہ باغ جس کا ہر گلِ تر منتظر بہار تھا
وہ باغ دلکشا کہ تھا اک بقعہ نور کا
وہ باغ جس میں چلتی تھی مستانہ آبشار

اک باغ دلفریب میں اپنا گزر ہوا
وہ باغ تھا کہ طبلۂ عطرِ بہار تھا
یا آئینہ تھا شانِ خدا کے ظہور کا
بانی تھا جس کا گریۂ عاشق سا بیقرار

ـــــــــــــ

لہ کشمیر کے ایک خوبصورت اور روح بخش مقام کا نام ہے (طالب)

وہ باغ شرحِ قدرتِ پروردگار تھا
سعدی کی گلستاں کی طرح تھا سدا بہار
ہرگز وہ باغ روضۂ رضواں سے کم نہ تھا
دامانِ گل میں تھی جو محبت کی رنگ و بو
ہر اک روش پہ فرشِ زمرد تھا آشکار
ٹھنڈی ہوا تھی چرخ پہ بادل تھے چھا رہے
عکسِ سمن سے صحنِ چمن میں تھی جوئبار
مستی کا رنگ مجھ پہ کچھ ایسا سوار تھا
ہر شاخِ گل پہ بہ یکِ نظر جھومنے لگا
اس طرح تھوڑی دیر ٹہلتا رہا وہاں
پھر پھر کے سیر باغ جو میں کر چکا تمام
منظر وہ ایک آنے میں پیشِ نظر ہوا
بہلا نظارہ محو سبھی یک قلم ہوا
کیا دیکھتا ہوں گا کے اک آشفتہ حال ہے
تکلیف و درد و غم میں وہ بے ہوش تھی پڑی
کرتی تھی بے زبانی سے تقریرِ بیکسی
وہ درد سے کراہتی یا جاں بے قرار
یہ حال اس کا دیکھ کے ٹکڑے جگر ہوا
بابا مجھے بتا کہ تیرا کیا یہ حال ہے

عہدِ خزاں بھی جس کا مثالِ بہار تھا
ہر برگِ گل سے دفترِ معنی تھا آشکار
ہر حوض اس کا چشمۂ حیواں سے کم نہ تھا
دلکش تھا عندلیبوں کا آغوشِ آرزو
دکھلا رہا تھا قدرتِ قادر کی جو بہار
طائر خوشی میں مل کے تھے سب چہچہا رہے
تکیہ لگائے تختۂ گل سے تھا کوہسار
گویا وہ میکدہ تھا میں اک بادہ خوار تھا
جوشِ طرب سے غنچۂ دل پھولنے لگا
دل بھی ہوائے گل سے بہلتا رہا وہاں
چلنے لگا تھا گھر کی طرف ہو کے شادکام
جس سے کہ حالِ دل کا رنگ دگر ہوا
افسردگی سی چھا گئی دل پر الم ہوا
بیکس ہے ناتواں ہے ضعیف اور نڈھال ہے
مانندِ شمعِ کشتہ وہ خاموش تھی پڑی
صورت تھی اس غریب کی تصویرِ بیکسی
ماتم کناں تھی حال پہ اپنے وہ سوگوار
اس سے مخاطب اس طرح باچشمِ تر ہوا
رنج و ملال و غم سے جو تو پائمال ہے

کیوں تو اسیرِ یاس ہے اے مادرِ وطن
بیزار کس لیے ہے تو لطفِ حیات سے
ناتا ہیں شیر خوار تیرے بچے ہم تمام
یہ سن کے اس نے دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
افسوس ہے کہ تم میں مروت نہیں رہی
افسوس ہے کہ غیرتِ قومی ذرا نہیں
پلاۓ جو دودھ سے تمہیں دیتے ہو اس کو زہر
محسن کشی کا عیب یہاں تو کبھی نہ تھا
ہوں اس زمانِ عدل میں پامالِ جور کیوں ؟
اٹھتے نہیں ہو میری حمایت کے واسطے
بچنے کی میری اب نہیں باقی ہے کچھ امید
وقتِ گذشتہ میں مری توقیر تھی بہت
بھگوان کرشن مجھ کو کھلانے کے واسطے
گوپال ان کا میری بدولت ہی نام تھا
آتے تھے شوق میں تو بجاتے تھے بنسری
الفت تھی گوپیوں سے بھی ٹھاکے انھیں مری
مجھ کو رشی منی بھی تھے رکھتے عزیز تر
افسوس اب تو کوئی نہ پرسانِ حال ہے
ہستی مری ہے فائدہ عام کے لیے

کس واسطے اداس ہے اے مادرِ وطن
دیکھا ہے تو نے ظلم و ستم کس کے ہات سے
پروردہ جو ہوئے فیض سے مرے ہیں خاص و عام
گویا زبانِ حال سے بولی وہ بیگناہ
محسن کی اپنے قدر و محبت نہیں رہی
جس دھرم کی رہی نہیں رحم اور دیا نہیں
جو تم پہ مہربان ہو کرتے ہو اس پہ قہر
تھے لاکھ عیب عیب مگر اک یہی نہ تھا
یہ ظلم اور ستم یہ تعصب کا دور کیوں
کھلتا نہیں ہے لب بھی شکایت کے واسطے
اے ہمدو تمہارا ہوا کیا لہو سفید
الفت کی مہربانی کی توقیر تھی بہت
جاتے تھے چپکے چپکے چرانے کے واسطے
مجھ سے ہی گوپیوں کو وہ اعزاز تھا ملا
مقصود ان کو تھی فقط اس سے خوشی مری
قدموں پہ میرے جھکتے تھے کہتے تھے جے ہری
تعظیم کو جھکاتے تھے میری وہ اپنا سر
بیدردی آپ کی بھی غضب بے مثال ہے
میرا وجود خلق کے آرام کے لیے

دنبی ہوں وہ میں وہ جو ہے مایۂ حیات
ہندو کے واسطے تو میں ہوں باعثِ نجات

پوری کچوری کھاتے ہو اور تر مٹھائیاں
افسوس ان کے بدلے مجھ سے رکھائیاں

محنت سے میری باغ بناتے ہو ریت سے
پیدا اناج کرتے ہو ہر سال کھیت سے

ملتا جو گھاس پھوس ہے چارا کسی طرح
کرتی ہوں میں اسی پہ گذارا کسی طرح

میری نظر میں شیخ و برہمن ہیں دونوں ایک
سب مجھ سے مستفیض ہیں وہ بد ہوں یا ہوں نیک

مکھن۔ ملائی۔ دودھ دہی کیا نہیں دیا
اُپکار میں پسینہ لہو میں نے اک کیا

میں کیا کہ میرے کنبہ سے خدمت ہے ملک کی
چلتی ہمارے دم سے زراعت ہے ملک کی

نادانی ہے جو لاؤ نہ تم مجھ کو دھیان میں
سورہ ہے ایک نام پہ میرے قرآن میں

دُنیا کا بوجھ سر پہ اُٹھائے ہوئے ہوں میں
عالم کے کاروبار رواں میرے دم سے ہیں

افسوس جس سے فائدے بے حد اُٹھاؤ تم
یوں اُس کو دکھ میں دیکھ کے آنکھیں چراؤ تم

خوش رکھ کے مجھ کو فائدہ تم اٹھاؤ گے
مجھ کو ستا کے آپ ہی نقصان اُٹھاؤ گے

میں ڈال دوں بچہ تو ہو کل کاروبار بند
صد حیف پھر بھی کوئی نہیں میرا دردمند

افسوس جن کی زیست سے یہ کچھ حصول ہو
ہے فکر اُس کی چمڑی سے دمڑی وصول ہو

کچھ درد اور رحم دلوں میں مگر نہیں
رکھتا جو میری آپ کو مدِ نظر نہیں

ماتا کے نام سے مجھے تم ہو پکارتے
میرے بچاؤ کے لیے ہمت ہو ہارتے

بے رحمیوں کو کرتے گوارا ہو کس طرح
میرا تمہارے پاس گذارا ہو کس طرح

طالب سُنی بپتا جو یہ اُس بے زبان سے
اک بجلی مجھ پہ ٹوٹ پڑی آسمان سے

واپس چلا میں گھر کو بصد سوزِ درد و آہ
کانوں میں گونجتی تھی وہ فریادِ بے گناہ

اس وقت میرا حال عجب دردناک تھا
پردہ دل و جگر کا میرے چاک چاک تھا

ہوش و حواس پر مرے سکتہ سا پڑ گیا
بے اختیار چیخ ۔ نکلی زبان سے
ہندوستاں میں اب کوئی کامل نہیں رہا

آباد باغ دل مرا اک دم اجڑ گیا
گویا کہ ایک توپ چلی آسمان سے
دھرم اور دیا پہ اب کوئی عامل نہیں رہا

۱۰

رامائن کا ایک دلکش سین نمبر ۲

ماہِ اکتوبر ۱۹۱۲ء یا اس سے کچھ عرصہ پہلے راقم رسالہ "دربار" لکھنو کے خاص مضامین نگاروں میں شامل ہو گیا۔ اور وقتاً فوقتاً منشی رام سہائے صاحب تمنا لکھنوی ایڈیٹر رسالۂ مذکور کے طلب کرنے پر ان کی خدمت میں مضامین نظم و نثر بھیجتا رہا۔ بلکہ اس طرح کچھ عرصے تک ابتدائی مشق کی حالت میں صاحب موصوف سے استفادۂ سخن کرنے کا موقع بھی ملا۔ ایڈیٹر صاحب کئی مہینوں تک رسالہ کے ساتھ ساتھ ایک ایک ضمیمہ بھی شائع کرتے رہے۔ جو اکثر دھارمک رنگ میں منظوم ہوا کرتا تھا۔ ماہ مارچ ۱۹۱۵ء کی اشاعت رسالہ کے ساتھ کے ضمیمہ کا مضمون لکھنے کے لیے راقم کو ارشاد ہوا چنانچہ اس کی تعمیل میں مندرجۂ ذیل سین لکھا گیا تھا اور حسب منشاء ایڈیٹر صاحب شائع ہوا۔ بلکہ اس کی تمہید کے ابتدائی چار اشعار بھی انھوں نے ہی لکھے یہ سین بعد میں اخبار "سناتن دھرم پرچارک" میں بھی چھپ گیا تھا +

———— ×❋× ————

راون اور سیتا ماتا کے باہمی سوال و جواب

تمہید

یہ راماین کا دلکش حسین مرغوب زمانہ ہے | یہ عبرت کا فسانہ یا نصیحت کا خزانہ ہے
سری سیتا نے کی رکھشا جو اپنی پارسائی کی | اسی سے استری کا دھرم عظمت میں یگانہ ہے
شراب کبر و نخوت سے ہوا مخمور جو راون | حماقت یہ اسی کی موت کا آخر بہانہ ہے
مضامین نصیحت خیز کر کے نظم خوبی سے | کیا زلف سخن میں خوب ہی دلبر[لہ] نے شانہ ہے

راون

رام کی فرقت میں سیتا بیقراری چھوڑ دے | شور و وبا و فغان و آہ و زاری چھوڑ دے
ہوتی ہے امداد بیکس میرے در پر روز و شب | اپنے شوہر کی بس اب طاعت گذاری چھوڑ دے
ہے بھلائی اس میں کر لے اپنی شادی میرے ساتھ | انتظار اب رام کے ملنے کا پیاری چھوڑ دے
اب مجھے باقی جو خواہش ہے اسے پورا کروں | تو یہاں سے واپسی کی فکر ساری چھوڑ دے

سیتا ماتا

تیرے قبضے میں نہ آؤنگی ڈھٹائی چھوڑ دے | بیحیائی۔ خودستائی۔ خودنمائی چھوڑ دے

لہ ان دنوں خاکسار دلبر ہی تخلص کرتا تھا۔ (طالب)

رامجی کو کب میں بھولوں تیری خوف و بیم سے
اور پر افعالِ زمانہ کچھ ادائی چھوڑ دے

موت ہی مجھ کو گوارا ہے حفظِ آبرو
استری کیوں کوئی اپنی پارسائی چھوڑ دے

رام جی کا وصل حاصل ہو تمنا ہی یہی
راون اب تو یہ خیال بجبائی چھوڑ دے

راون

رام ہے کمزور اس سے دل لگانا چھوڑ دے
آمرے پہلو میں اب باتیں بنانا چھوڑ دے

قید جس گلشن میں ہے تو جس سے آرام کر
عاشقِ جانباز کا اب دل جلانا چھوڑ دے

مان لے کہنا مرا ورنہ کرونگا تجھ کو قتل
ہٹ نہ کر بیہودہ یہ باتیں سُنانا چھوڑ دے

دیکھ پیاری جانکی ہے جبر اس میں جانکی
جس سے لذت روح کو ہو وہ نہ کھانا چھوڑ دے

سیتا ماتا

رام میں طاقت نہیں گر پھر یہ وحشت چھوڑ دے
کیوں چرا کر مجھ کو لایا تو یہ ذلت چھوڑ دے

موت سے ڈر ظلم کی اپنے سزا پائے گا تو
خواہشِ بے جا کی کوشش اور شرارت چھوڑ دے

کرتی ہے ظالم کو غارت پارسا عورت کی آہ
تو ہے مُورکھ اور کُھلکا می جہالت چھوڑ دے

قول سے اپنے نہیں ٹلنے کی میں اے بدخصال
خیر ہے اس میں کہ تو بیہودہ خصلت چھوڑ دے

راون

خوب صلواتیں سنیں اب بیوفائی چھوڑ دے
بہتری جا ہے اگر ایسی برائی چھوڑ دے

دیکھ اور آنکھیں لڑا کچھ مسکرا کر بات کر
صلح کا موقع ہے اب مجھ سے لڑائی چھوڑ دے

کوہ میں ہیں رام تیرا کاہ سے بھی کم ہیں
اے خیال خام میں بخت آزمائی چھوڑ دے

میری دہشت سے لرزتے ہیں زمین و آسماں
ہے تعجب تو اگر مجھ سا فدائی چھوڑ دے

سیتا ماتا

دور ہو کمبخت اب سایہ ہمارا چھوڑ دے
کج ادائی سے یہ ارد کا اشارا چھوڑ دے

تیرے ظلموں کی خبر پائیں جو لچھمن ہو غضب
سنگدل سختی یہ مثلِ سنگِ خارا چھوڑ دے

میرے آگے چل نہیں سکتی تمہاری کوئی چال
کب قضائے جانستاں پیچھا تمہارا چھوڑ دے

تیرے ظلم و جور سے اب دیوتا بھی تنگ ہیں
یہ تو اپنی عادتِ بد اے خود آرا چھوڑ دے

راون

ہٹ پہ قائم رہ کے تو مجھ کو ستانا چھوڑ دے
رنج و غم سے دل مرا غمگیں بنانا چھوڑ دے

میں تڑپتا رات دن ہوں صرف تیری یاد میں
مجھ سے اے ماہِ منوّر منہ چھپانا چھوڑ دے

ہے یہاں موجود زیور اور لباسِ فاخرہ
کیا حماقت ہے جو تو ایسا خزانا چھوڑ دے

کتنے دن میں نے گذارے اشتیاقِ وصل میں
رامجی کی یاد میں تو جی کڑھانا چھوڑ دے

سیتا ماتا

میں نہ مانوں ایک بھی تو زشت کاری چھوڑدے
خوف کر یہ استری کا بیقراری چھوڑدے
تو تڑپتا ہے اگر نکلے گی تیری جان بھی
نشہ سب ہوگا ہرن یہ بادہ خواری چھوڑدے
مجھ کو کیا پرواہ ہے تیرے زیور و ساماں کی
جال پھیلانے کی عادت اے سکاری چھوڑدے
جان کی منظور ہی گر خیر مجھ کو بے حیا
تو یہ بد اخلاقیاں اور بدسعاری چھوڑدے

راون

تو ہی میری مجھ سے مل کر بیوفائی چھوڑدے
عیش و عشرت میں بسر کر کج ادائی چھوڑدے
میرے حالِ زار پر مجھ کو ترس آتا نہیں
میری خاطر رام کی تو آستائی چھوڑدے
جاہ و حشمت۔ شان و شوکت سے بسر کر تو یہاں
دل سے اس آوارہ کے در کی گدائی چھوڑدے

ہو یہ تنہائی کا موقع گرم کر میری بغل
آستانِ رام کی اب جبّہ سائی چھوڑ دے

سیتا ماتا

بیکسوں کو تنگ کرنا اور ستانا چھوڑ دے
ماہیِ بے آب کے دل کا جلانا چھوڑ دے
آئیں گے جب میرے سوامی مار ڈالیں گے تجھے
اس طرح پر استری کا دل دکھانا چھوڑ دے
بھول جائیں رام لچھمن مجھ کو یہ ممکن نہیں
ایسی حالت میں مجھے پٹی پڑھانا چھوڑ دے
کھیل جاؤنگی میں اپنی جان پر یہ یاد رکھ
مجھ سے اے بدذات تو یہ سوانگ لانا چھوڑ دے

خاتمہ

جانکی دراون لنکا کی جو نفریہ ہے
پارسائی عورتوں کی کیوں نہ مشہور خلق
جو نگاہِ بد سے دیکھے غیر عورت کی طرف

بناستہ خالی نہیں ہو اور پر تاثیر ہے
ہند میں قائم انہیں سے دھرم کی توقیر ہے
اس کمینے کو سزا ملنے میں کب تاخیر ہے

خالی عبرت سے نہیں طالب یہ رامائن کا سین
فیضیاب اس نظم سے طبع جوان و پیر ہے

(۱۱)

کرشن بھجن

یہ بھجن ۷ رنومبر ۱۹۱۳ء کو لکھا گیا تھا اور مندرجۂ بالا رامائن کے سین کے ساتھ ضمیمۂ "دربار" لکھنؤ میں شائع ہوا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے رسالۂ "پریم بلاس" گوجرانوالہ میں بھی چھپ گیا تھا۔

مرے کرشن اپنی صورت گر دکھا دو گے تو کیا ہو گا۔
یہ دل کی بیقراری یوں مٹا دو گے تو کیا ہو گا
کبھی متھرا ہیں گوکل میں نکل آؤ ذرا کھیلو؛
صدا مرلی کی تم اپنی سُنا دو گے تو کیا ہو گا
تمہارا ہی تصور باعثِ تسکینِ راحت ہے؛
دل اِس دنیائے فانی سے ہٹا دو گے تو کیا ہو گا
بہت تم کو ملا ہی دودھ اور مکھن جسودھا سے
ہمیں اس میں سے تھوڑا سا پلا دو گے تو کیا ہو گا
ترا اُپدیش سُن سُن کر یہ تیرے بھگت کہتے ہیں
اگر گُرمنتر ہم کو بھی بتا دو گے تو کیا ہو گا

تمہاری یاد کرتا ہی نہیں غافل میں ایسا ہوں
مجھے اس دامِ غفلت سے چھڑا دوگے تو کیا ہوگا

جہاں سے دھرم جب اُٹھ جائیگا آنے کا وعدہ ہے
اب اپنا عہد بھی پیارے نبھا دوگے تو کیا ہوگا

تمہاری یاد میں روتا ہوں ہردم نند کے لالہ
دکھا کر شکل طالب کو ہنسا دوگے تو کیا ہوگا

(۱۲)

رامائن کا ایک دردناک سین

۱۱- مارچ ۱۹۱۷ء - مطبوعہ "سناتن دھرم پرچارک" امرتسر

لچھمن جی مہاراج کا غش ہونا

راوی

بج گیا ہی آج کیوں کہرام رن میں اس قدر
کیا ہوا کیونکر ہوا۔ کیسی قیامت آگئی

بند ہوتی ہی زباں کیوں یوں ہی ہن لب ہیں قدر
کس لیے آہ و بکا اُٹھتی ہی من میں اس قدر

آج کیوں احوال ہے زندوں کا مردوں سے خراب
کیوں پریشاں ہو رہی ہے جان تن میں اس قدر

جس طرف دیکھو الم کا ہے سماں چھایا ہوا
کیوں الم ہے قلب ہر شمشیر زن میں اس قدر

برگِ گل پر تھا بجا برگِ خزاں کا احتمال
رنگ پھیکا پڑ گیا ہو گا چمن میں اس قدر

زخم سے بیہوش لچھمن ہو گئے جنگاہ میں
اس لیے روتے ہیں سب بیت الحزن میں اس قدر

اے فلاکت صدمہ ان کے دل کو پہنچانا نہ تھا
رام پر گزرا تھا کیا کم بیچ بن میں اس قدر

کاش لچھمن پر برسانے لگیں آکاش سے
زندہ ہو کر ڈالدیں ہلچل وہ رن میں اس قدر

لچھمن جی مہاراج کے غش ہونے پر سری رامچندر جی مہاراج کی گریہ وزاری

ہو گئی تجھ پر عدم کی نیند طاری ہائے ہائے
تجھ کو ہو آرام مجھ کو بے قراری ہائے ہائے

چاند سا مکھڑا دکھا کر منہ چھپانا کس لیے؟
کیوں اکیلا چلدیا منزل ہے بھاری ہائے ہائے؟

ہائے لوٹونگا اجدھیا کو میں کیا تیرے بغیر؟
کیا وہاں جا کر اٹھاؤں شرمساری ہائے ہائے؟

حال کیا ہوگا سمترا کا جدائی میں تری
منتظر آنے کی تیرے ہے وہ پیاری ہائے ہائے

تھی ترے ہی زور بازو پر رہائی کی امید
زندہ مر جائے گی اب سیتا ہماری ہائے ہائے

دیکھ پیارے کس طرح ہوں تُھنتیں میں کر رہا
کیا ہوئی بھائی تری الفت شعاری ہائے ہائے

میری جانب سے یہ تیرے کان کیوں بہرے ہوئے
تو نہیں سنتا جو میری آہ و زاری ہائے ہائے

کون راون کا کریگا خاتمہ اب جانِ من
سو گیا ہے مست تیرا دشمن دھاری ہائے ہائے

تیرے جینے سے علاجِ دردِ دل کچھ ہو تو ہو
ورنہ ہو کیوں کر یہ اچھا زخم کاری ہائے ہائے

دل میں آتا ہے کہیں چلدوں میں کپڑے پھاڑ کر
یاد جب آتی ہے تیری غمگساری ہائے ہائے

تو جو اُٹھ بیٹھے تو دشمن اپنے سب نابود ہوں
شیخی ان کی کرکری ہو جائے ساری ہائے ہائے

تجھ سے پہلے مجھ کو مرنا چاہیئے تھا جانِ من
لیگیا ہے پیارے تو ہی میری باری ہائے ہائے

تیر و ترکش دست و بازو ہو گئے سب بے نوا
ایک نے بھی کی نہ میری آہ ! یاری ہائے ہائے

پریم سے بھائی کے لچھمن دل بڑا لبریز تھا
ہو گیا کیا ایک دم الفت سے عاری ہائے ہائے ؟

دھرم پتنی کی جدائی تھی مجھے سوہانِ روح
کھب گئی سینے میں یہ اور اک کٹاری ہائے ہائے

میں نہ جیتا رہ سکوں گا ایک دم تیرے بغیر
دیکھ لینا تو بھی میری جاں سیاری ہائے ہائے

ایسی بیزاری ہی کیا جو بات تک کرتا نہیں ؟
کیا یہی پیارے ہے شرطِ دوستداری ہائے ہائے ؟

دل کریں آرام لچھمن سُرگ میں سُکھ چین سے
رام بے آرام ہو مشغولِ زاری ہائے ہائے

او کماندارِ قضا کیا تیر تھا میرے لیے ؟
کیوں پسند آئی تمہیں یہ میری خواری ہائے ہائے ؟

یوم پرلے تک رہیں گی میری آنکھیں اشک ریز
سرگ میں بھی سیل اشکوں کے ہوں جاری ہائے ہائے

راونِ ملعون اب تو دل ہے ٹھنڈا تیرا
چل گئی سینے پہ میرے غم کی آری ہائے ہائے

بھائی لچھمن سا مرے اور میں بھی جیتا رہوں
حق میں میرے کیا ہوا یہ قہر باری ہائے ہائے؟
تو ہی ہوتا پاس میرے آج کے دن کاش ہائے
اے بھرت لچھمن پہ کرتے مل کے زاری ہائے ہائے
تم بھی لچھمن کی حفاظت میں رہے قاصر ہو!
بھول بیٹھے اپنی ساری ہوشیاری ہائے ہائے
سچ ہی دکھ سنکٹ میں کوئی شاذ ہی دیتا ہے ساتھ
دیتے جاتے ہیں دغا سب باری باری ہائے
ایک ایک کر کے بھی گو کل دشمنوں کو مار لوں
ہو نہیں سکتی تلافی اس کی ساری ہائے ہائے
رخصت اے سگریو اپنے ملک میں جا کر رہو
ساتھ میں دینا جو ہوتا لطف باری ہائے ہائے
جامونت اور دوستوں کو بھی میں کہہ دوں خیرباد
بند ہو گی جنگ جو اب تک بھی جاری ہائے ہائے
اک چتا سی شعلہ زن سینہ کے اندر ہی مرے
کب بجھا سکتی ہے اس کو اشکباری ہائے ہائے
ہو گا کیا گر جان بھی دے دوں میں تیرے ہجر میں
مر کے بھی ہو گی نہ کم یہ سوگواری ہائے ہائے

شری رامچندر جی مہاراج کی گریہ وزاری پر لچھمن کی تسلّی و تشفّی

کیا غضب ہے رام ہو یوں مبتلائے رنج و غم؟ — اور زباں پر اس کے پیہم ہو صدائے رنج و غم
بحرِ غم طے ہو نہ مارے لاکھ کوئی ہاتھ پانو — کیجئے ہرگز نہ لب کو آشنائے رنج و غم
کر گئی دل اور جگر کو چوٹ مگر سیری نہیں — کیا سبب ہے کیوں بڑھی ہے اشتہائے رنج و غم
رونے دھونے سے تو لچھمن زندہ ہو سکتا نہیں — وہ کرو تدبیر ٹوٹے جس سے پائے رنج و غم
کب سجتا ہے تنِ عریاں کو ماتم کا لباس — چاک کرنی چاہیئے اب تو قبائے رنج و غم
وید ھ لاؤ کوئی اس کو بلانا چاہیئے — دے کے امرت جو کرے اس کا ازالۂ رنج و غم
ایک شاہی وید لنکا میں بڑا مشہور ہے — نام سوکھین ہے کریگا وہ دوائے رنج و غم
دیکھ لینا پائینگے لچھمن دوبارہ زندگی — تیرے لب پر واہ وا ہو گی بجائے رنج و غم

خاتمہ

زندگی سے رام اپنی آج کیوں بیزار ہے؟ — ہاں مگر مہرِ برادر کا اُسے آزار ہے
ہند کے اے نوجوانو تم بھی لو اس سے سبق — قابلِ تقلید بے شک رام کا اوتار ہے
ہیں کہاں ایسے برادر اور یہ الفت کہاں — آج کل تو باپ بیٹے میں نہ باہم پیار ہے
رام کے نقشِ قدم پر جو چلا اے بھائیو — بحرِ ہستی سے بلا شک اس کا بیڑا پار ہے

دور پیشانی سے جو نفرت کا دھبہ کر چکا — سرخروئی کا اسی کے زیب گردن ہار ہے
طوق الفت کون پہنیگا کہ عنقا ہو گیا — بھائیوں میں اب تو چلتی ہر طرف تلوار ہے
رام کے قدموں پہ سر رکھ پائیگا نقاء مرام — رام اپنایا رہے دلبر ہے اور دلدار ہے

ہاں دیا سے رام کی طالب کا بیڑا ابھی ہو پار
بیکسوں کا ہر دو عالم میں وہی غمخوار ہے

(۱۳)

مبارک تیوہار شیو راتری

۳ فروری ۱۹۱۶ء مطبوعۂ سناتن دھرم پرچارک امرتسر

غور سے سنیے گا صاحب آج کیا کہنے کو ہوں — تم سے میں اک داستانِ غم زدا کہنے کو ہوں
اپنے مضموں کو کہوں گا آپ میں روشن ہوا — صفحۂ لوح دلِ اہلِ صفا کہنے کو ہوں
آج ہی مضموں میں کیا نورِ معنی کی جھلک — خیر مقدم تجھ کو اے طبع رسا کہنے کو ہوں
منتظر کیوں ہے صدائے ناقۂ لیلیٰ کا قیس — میں صریر خامہ کو بانگِ درا کہنے کو ہوں
واہ وا کیا آج ہی جوشِ مسرت دہر میں — اہلِ عالم کی ادا کو دلربا کہنے کو ہوں

جلوۂ نور ازل دیدم دلِ من شاد شد
در شب تاریک ویراں خانہ ام آباد شد

آئی ہے شیو راتری لے موسم سرما سلام — جو بہار جانفزا کا پیش خیمہ ہے مدام
سبزہ نکلا ہے زمیں سے اوڑھ کر پوشاک نو — سرو قد کرنے لگے اطراف بستاں میں خرام
عیش و عشرت کا سماں آتا ہے ہر جانب نظر — اس مبارک وقت میں ہے رنج و غم قطعاً حرام

اس طرح آئی ہیں کلیاں سیرِ بستاں کے لیے — جس طرح جائے دلہن سسرال با صد احترام
رقص کرتے آئے ہیں کیا نازنینانِ چمن — ہو رہا ہے راس لیلا کے لیے کیا احتشام

این مسرت در حقیقت قابلِ صد داد ہست
فرخا اے دوستاں وقتِ مبارکباد ہست

اے حجابِ چشم تجھ پر آج میں قرباں ہوا — تیرے اُٹھنے سے ہی میرے درد کا درماں ہوا
وہ محیطِ کل مرا خالِ سویدا بن گیا — کعبۂ دل میں ظہورِ عالمِ امکاں ہوا
دیدۂ بینا میں پتلی کی طرح وہ کھب گیا — ذرّے ذرّے میں ظہورِ قدرتِ یزداں ہوا
عالمِ کثرت میں اپنی شانِ وحدت سے سوا — جلوہ گر کون و مکاں میں آج وہ جاناں ہوا
کم نہیں تسبیح سے میرے لیے اشکوں کا تار — پنجۂ مژگاں مثالِ پنجۂ مرجاں ہوا

طالبِ مہجور از وصلش چرا شد بیقرار
تشنہ چوں نالد چو در دستش است آبِ خوشگوار

مراثی

مرثیہ بر وفاتِ حسرت آیات پنڈت نریندر ناتھ صاحب کول ایم اے ریونیو ممبر سٹیٹ کونسل ریاست جموں و کشمیر

۵ جنوری ۱۹۲۲ء کو سٹیٹ کونسل ریاست جموں و کشمیر کے ہر دلعزیز ریونیو ممبر پنڈت امرناتھ صاحب کول ایم۔ اے عین شباب میں بعارضۂ بواسیر چند روز کی تکلیف میں مبتلا ہو کر اس عالم فانی سے رحلت کر گئے۔ پنڈت صاحب سر گیا شی کو ریونیو ممبری کا چارج اس وقت دیا گیا تھا جبکہ اس عہدے کی حالت نہایت نازک تھی۔ قریب قریب تمام افسر ملک کی تمدنی۔ اور معاشرتی حالت کے سنبھالنے میں عاجز آ گئے تھے۔ باشندگانِ ریاست شالی اور دیگر اشیاء کی ناقابل برداشت گرانی کی وجہ سے سخت تکلیف و مصیبت میں گرفتار تھے۔ شالی کے قحط اور خاص کر غلہ داروں کی بدنیتی اور طمع سے اس کی قیمت فی خروار سترہ اٹھارہ روپے تک پہنچ گئی تھی۔ لوگ بھوک کے مارے مر رہے تھے۔ ایسی حالت میں آپ کا بعہدۂ مشیر مالی تقرر ہونا جملہ لوگوں کے لیے کتنا مفید ثابت ہوا۔ محتاج بیان نہیں۔ آپ نے اپنی لیاقتِ مسلمہ اور خداداد ذہانت و قابلیتِ جلیلہ کی بدولت لوگوں کی خاطر کس قدر جانفشانی اور عرقریزی سے کام کیا۔ کسی سے پوشیدہ نہیں شالی کا انتظام سرکاری طور پر ہاتھ میں لے لیا۔ اور غلہ داروں و دیگر ضرر رساں لوگوں کی غیر واجبی کارروائیوں کا مناسب انسداد کر کے ملک کو نہال کر دیا۔ قیمت فی خروار بجائے اٹھارہ روپیہ کے پانچ روپیہ مقرر کر دی اور اس طرح رعایا اپنے آپ کو سنبھالنے کے قابل ہو گئی۔ بلکہ فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے لگی۔ ان کی ہر دلعزیزی کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ان کی وفات پر کیا ہندو کیا مسلمان کیا مرد کیا عورت ہر فردِ بشر آہ و زاری اور اشکباری

میں مصروف تھا۔ ان کی بے وقت وفات سے ریاست کو جو نقصان عظیم ہوا ہے اُس کی تلافی ہونی مشکل ہے۔ اور باشندگانِ کشمیر تو اس کے نعم البدل پانے کے بمشکل معتقد ہیں۔ یہاں کے صاحبانِ انگریز کو بھی مرحوم کی اعلیٰ دماغی اور قابلیت نے ان کا مداح اور گرویدہ بنا رکھا تھا۔ بلکہ انھیں کی تحریک سے وسیع پیمانے پر نربیدرناتھ میموریل فنڈ قائم کیا گیا۔ اس غرض کے لیے ان کی وفات کے چند روز بعد سی۔ ایس۔ ایم۔ ہائی سکول سری نگر میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ حاضرین کی تعداد قریب پانچ ہزار کے تھی۔ اس جلسہ میں علاوہ مذکورۂ بالا مقصد کے مرحوم کی بے وقت موت پر اظہار حسرت اور افسوس کیا گیا۔ خاکسار سے بھی اس موقع پر ایک نظم لکھنے کی فرمائش ہوئی۔ چونکہ راقم بھی ایسے نیک دل۔ محبِ وطن اور فدائے ملک کی موت سے متاثر ہوا تھا۔ جلسے کے منعقد کیے جانے سے پہلے ہی یعنی ان کے وفات پانے پر ذیل کا مسدس لکھا تھا۔ اس کو پڑھ کر سنایا۔ اس سے جو رقت کی حالت راقم پر اور اکثر حاضرین پر طاری ہوئی۔ وہ خاکسار کے صفحۂ خاطر سے مٹنی محال نظر آتی ہے۔ یہ مسدس انہی دنوں میں ایک لیفلٹ کی صورت میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ تقسیم ہوا تھا اور "اخبار عام" لاہور میں بھی شائع ہوا تھا۔

کشمیر کیوں بنا ہوا ماتم سرا ہے آج
ہستی کا کس کی ہائے نشاں مٹ گیا ہے آج
کہرام کس کی موت پہ یکسر بپا ہے آج
مرنے پہ کس کے ہو رہا غم جا بجا ہے آج

چھوٹا ہی ہم سے کون کہ جی چھوٹتا ہی آج؟
رہ رہ کے کس کا نام گلا گھونٹتا ہی آج؟

ہی حال غیر آج الٰہی یہ کیا ہوا؟
کیوں درد ابتدا کا غم انتہا ہوا!

منظر تمام عیش کا کیوں غم فزا ہوا؟
ہی بیکسی میں کون یہ ہم سے جدا ہوا؟

چھایا یہ ابر غم کا جو نزدیک و دور ہی
کشمیر کا ہر ایک بشر نا صبور ہی

کیوں ہر بشر کا حال یہاں دردناک ہی!
بکھرے ہوئے ہیں بال پڑی سر پہ خاک ہی!

آنکھوں سے خون جاری ہی سینہ بھی چاک ہی!
دوزخ سے آج کم نہیں یہ خلد پاک ہی

آنکھوں سے دور کس کی ہوئی شکل دلپذیر
دیکھو جسے ہی درد و غم و رنج میں اسیر

سنسان کیوں ہیں دفتر و بازار ہائے ہائے
تھی کس کے دم سے رونق دربار ہائے ہائے؟

کیا چل بسا ہے ملک کا غمخوار ہائے ہائے؟
کون اٹھ گیا ہی حامی سرکار ہائے ہائے؟

کس کے فراق نے ہمیں مارا ہی دوستو؟
باقی بتاؤ کس کا سہارا ہی دوستو؟

وہ فاضل زمانہ بہی خواہ کاشمیر
اعلیٰ وزیر و معتبر شاہ کاشمیر

مشکل کشا و پیش رو راہ کاشمیر
سمجھا تھا آسماں بھی جسے ماہ کاشمیر

بے وقت ہائے اس کا یہ مرنا ستم ہوا
جیتے جی جان دینے سے بڑھ کر یہ غم ہوا!

وہ اہلِ ہوش درد سے بیہوش ہوگیا
افسوس فخرِ قوم کفن پوش ہوگیا

آئی خبر کہ شمع سا خاموش ہوگیا
آج اِک عزیز بارِ سرِ دوش ہوگیا

پیوندِ خاک دل کا ہر ارمان ہوگیا
جس گھر پہ جاں کھپائی تھی ویران ہوگیا

کہتے تھے جس کو قوم کا شہباز دیکھنا
طرز جفائے چرخِ فسوں ساز دیکھنا

رخصت ہوا وہ صاحبِ اعزاز دیکھنا
کشمیریوں کا طالعِ ناساز دیکھنا

ظلمِ شدید طبع پہ ہو کیوں گراں نہیں؟
باقی وہ اب زمیں نہیں وہ آسماں نہیں

سینے میں دل - دلوں میں رہی آرزو نہیں
باقی وہ قوم کی رہی اب آبرو نہیں

آنکھوں کو دیدِ یار کی بھی جستجو نہیں
جب تو ہی اس جہان میں اے سرخرو نہیں

تیری وفات کس کے لیے وجہ غم نہیں؛
سچ پوچھیے تو قوم کے مرنے سے کم نہیں

پیدا کریگا تجھ سا بھی کوئی زمانہ کیا؛
ہم کو ہے تیرِ غم کا بنائے نشانہ کیا

سنتے رہیں گے قوم کا آخر فسانہ کیا؛
اے وائے آفتوں پہ یہ پھرتا زمانہ کیا

پہلو میں کر رہا ہے نہیں درد بیقرار
دِل ہو چکا ہے تیرِ حوادث کا اب شکار

دن رات تو لگا رہا شالی کے کام میں
ہر دلعزیز تو ہوا شالی کے کام میں

دن رات ایک کر دیا شالی کے کام میں
القصہ کام آگیا شالی کے کام میں

تھے جتنے فتنہ گر وہ سبھی روسیہ ہوئے
آخر ذلیل و خوار بہت بے شبہ ہوئے

عالم میں لاجواب وہ تقریر تھی تری
رائے رزیں سے کم نہیں تدبیر تھی تری
دنیا میں بے نظیر وہ تحریر تھی تری
تجویز ایسی گویا کہ تقدیر تھی تری

تھا مسئلہ وہ کون سا جس پر نہ تھا عبور؟
بے وقت داغ دے گیا تو ہائے ذی شعور

اے ناخدائے قوم وہ الفت کدھر گئی؟
وہ جوش کیا ہوا وہ حمیت کدھر گئی؟
وہ آنکھ کیا ہوئی وہ مروت کدھر گئی؟
حب وطن کی ہائے وہ غیرت کدھر گئی؟

مجبور تھا کہ موت سے کچھ بس نہ چل سکا
باہر نہ حکم حق سے تو شاید نکل سکا

ہم خوبیوں کا تیری کریں کیا شمار حیف
ہے چشم اشکبار تو دل ہے نزار حیف
جلنے سے تیرے ہونٹوں پہ ہے بار بار حیف
کیا جانگزا یہ سانحہ ہے صد ہزار حیف

طالب مگر زگریہ بہ مطلوب کے رسد؟
چوں بدنصیب ماست بمحبوب کے رسد؟

۲

نوحۂ طالب بنارسی

ماہ فروری سنہ ۱۹۲۲ء میں منشی سروپ سنگھ صاحب مفتوں لکھنوی کا

ایک گرامی نامہ موصول ہوا جس میں انھوں نے منشی ونایک پرشاد صاحب طالب بنارسی سرگباشی کی سوانح عمری قلمبند کرنے کا اظہار کیا تھا اور خاکسار سے اس کتاب کے لیے مرحوم کی وفات پر ایک منظوم نوحہ طلب فرمایا تھا راقم کو اگرچہ طالب مرحوم کے ساتھ کوئی ذاتی تعارف یا شناسائی نہ تھی تاہم ان سے غائبانہ تعلقات ضرور تھے۔ مرحوم راقم کے ہمعصر اور ہم فن و نیز ہمنام تھے۔ اکثر رسائل و اخبارات میں اُن کے اور بندہ کے مضامین ساتھ ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ مفتوں صاحب کے ارشاد پر ذیل کا نوحہ لکھکر ان کے پاس بھیجدیا تھا۔

پھر رہا تھا ایک دن میں خستہ حال
دل گرفتہ تھا طبیعت تھی نڈھال
دور سے دیکھا کہ آتا ہے کوئی
پاس آکر یہ کیا اس نے سوال
کیا ہوا ہے تجھ کو اے یار عزیز
غمزدہ اتنا ہے کیوں اور پرملال
کیوں ہے تو آوارۂ دشتِ الم
ہو گئی کیوں زندگی تجھ کو وبال
تھا سراسیمہ نہ سمجھا دیر تک
کون مجھ سے کر رہا تھا یہ مقال
کھول کر جب آنکھ دیکھا تو کھلا
کون تھا یہ خیرخواہ و خوشخصال
دم میں وہ شمبھو[1] مجھے آئے نظر
آگیا تب مجھ پہ غالب انفعال

[1] میرے گرامی نامہ دوست پنڈت شمبھو ناتھ صاحب دیبی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی سے مراد ہے (طالب)

چونکہ اٹھا اور کہا کہنا معاف — مجھ کو ہی یارِ عزیز ازبس ملال
کچھ نہ پوچھو باعثِ حسرت ہی کیا — آہ کیا تم سے کہوں صاحبِ کمال
تھا ہمارا ہند میں ہمنام[1] ایک — کر گیا دنیا سے وہ اب انتقال
نکتہ سنج و ماہرِ فنِ سخن — خوش[illegible] وہ شاعرِ شیریں مقال
ناظمِ جادو رقم، نازک نگار — ہند میں تھا بے عدیل و بے مثال
چشم پا افتادہ تھے اس کے لیے — جدّتِ شعر و سخن۔ تازہ خیال
نظم میں ثابت کیا زورِ قلم — نثر میں حاصل کی صیتِ لازوال
قائلِ ہندو ہوں اس کا سن پاتے تھے جب — وجد میں آتے تھے سارے اہلِ حال
کیوں نہ ہو افسوس کا اظہار حیف — جب ہوا اس دنیا سے اس کا انتقال
زخم کھائے وہ تنِ اشعار نے — بعدِ مدت جن کا ہوگا اندمال
اٹھتے جاتے ہیں سبھی اہلِ قلم — نکتہ سنج آتے نظر ہیں خال خال
اب کہاں علم و ادب کی صحبتیں — محفلیں سب ہو گئیں خواب و خیال
اڑ گئی سب رونقِ بزمِ ادب — مٹ گئے روئے سخن کے خط و خال
اس لیے افسوس آتا ہے مجھے — اس لیے غم سے ہوا ہوں پائمال
سن کے میرے دوست کہنے لگے — گو بجا ہے آپ کا غم حسبِ حال
آدمی مجبور ہے اس موت سے — چل سکا ہے کب قضا سے کوئی چال

[1] ہمنام سے مطلب ہم تخلص ہے۔ یعنی مرحوم منشی صاحب بھی طالب ہی تخلص کرتے تھے
(طالب)

حکم حق برحق ہے اور باقی فنا | ماننا پڑتا ہے یہ بے قیل و قال

تو حصولِ مطالب سے کیا طالب ملے
ایک دن ہوگا یہی سب کا مآل

متفرق نظمیں

(۱)

کسی کی یاد میں

یہ نظم اصلی واقعہ کے تقریباً تین ماہ بعد ۳ ستمبر ۱۹۱۵ء کو نہایت بے قراری اور اضطراب کے عالم میں لکھی گئی۔ اس کی سرخی اوّل "یادِ مرحومہ" تجویز ہوئی تھی جو مضمون کے اعتبار سے زیادہ موزوں تھی۔ اس نظم میں قریب قریب وہی رنگ ہے جو انگریزی زبان کے مشہور شاعر جان ملٹن کی نظم "لسی ڈاس" میں پایا جاتا ہے۔ اس نظم کے متعلق اُستادِ نامدار نے یہ فرمایا تھا کہ یہ دل سے نکلی ہوئی ہے اور اس میں کچھ ردوبدل کرنا مداخلت بیجا بلکہ اس پاک یادگار کی توہین کرنی ہے۔ اس کو کسی اخبار یا رسالے میں چھپوانا مناسب نہ سمجھا گیا۔

بعد مدت چھیڑتا ہوں اک پرانی داستان
داغہائے دل کو ہھر کرتا ہوں اپنے گلفشاں
بھر گیا پیمانہ اک دن میرے صبر وضبط کا
پھوٹ نکلے ڈبڈبائی آنکھ سے اشکِ رواں
کچھ دنوں سے تھا طبیعت کو ذہن حزن و ملال
اور ماتم خانہ آتا تھا نظر سارا جہاں
یہ دلِ غمگیں مراقب تھا کسی کی یاد میں
اور خاموشی بنی تھی حال کی گویا زباں
خونِ حسرت یوں ٹپکتا قلب مضطر سے مرے
تختۂ بلور سے جس طرح عکسِ ارغواں
تھے لبِ اظہار خاموشی سے میری جلوہ گر
زعفراں کی بوئے خوش جیسے بکشتِ زعفراں
تھا ہجوم یاس وحسرت اس دلِ پُر درد میں
آہ اُٹھتی تھی جگر سے جیسے گلخن سے دھواں
ایسے عالم میں نہ تھا کچھ سوجھتا ہرگز مجھے
تھا کسی کے ہجر میں بیزار قلبِ ناتواں
تھا نہ دم بھر کو بھی حاصل مجھ کو کچھ صبر و سکون
جی جلا جاتا تھا میرا تھے سلگتے استخواں

محوِ حیرت ہو گئے ہیں اک نقش بر دیوار تھا
کر چکا گویا تھا خاکستر مجھے سوزِ نہاں
ایسی حالت میں تھے بستر کے سب ہوش و حواس
تھی زبانِ حال واقف دردِ دل تھا ہمزباں
بارِ غم سے تنگ آ کر شام ہی سے سو رہا
تا کہ چھائے سوزِ خاطر پر خموشی کا سماں
بسترِ غم پر کبھی مضطر کبھی بے ہوش تھا
ہو گئی جب مجھ پہ طاری حالتِ خوابِ گراں
عالمِ رویا میں وہ صورت نظر آئی مجھے
میں کبھی ہوتا تھا جس کے درشنوں سے شاداں

فرطِ دلداری سے وہ گویا ہوئی بہار اس طرح
باوفا معشوق ہو گرمِ تکلم جس طرح

آج وہ نقشہ پھرا ہے چشمِ دریا بار میں
کھینچ لایا ہم کو فوراً آپ کی سرکار میں
آج کچھ شکر و شکایت کا ہے موقع آپ سے
حالِ دل کرنا عیاں ہے پردہ گفتار میں
یاد ہیں کیا آپ کو وہ دن کہ با صد اشتیاق
تھیں نیاز و ناز کی باتیں محبت بار میں
جب نہ ہم دنیا کے جھگڑوں اور جھمیلوں میں پھنسے تھے
جب نہ دل اپنے پھنسے تھے معرضِ افکار میں
جب اشاروں میں ہم باتیں وہ ہو جاتیں کبھی
نطق کی دیوی سی بھی آئینے جو اظہار میں
کھینچ لے جاتی تھی کہ ہے الفتِ باغِ نشاط
تھے نسیم و عیش ہی اور گاہ شالامار میں
آہ! وہ دن کیا ہوئے جب مجھ پہ تو قربان تھا
تھیں امنگیں یوں دلوں میں جیسے گل گلزار میں

باعثِ تسکینِ خاطر جب کہ تھا تیرا کلام
لطف تھا سو آشتی کا جب بھی تکرار میں

ساز تھا ہم کو نہ زیر و بم سے عالم کے کہ تھا
ایمن اور کلیاں پیدا ہر نفس کے تار میں

روشناسی تک نہ تھی ہم کو عروسِ مرگ سے
پھول تھا دامانِ راحت کا نہ اُلجھا خار میں

تھا ہمارا اتفاقِ باہمی ضرب المثل
مشتہر تھا جوشِ اُلفت کوچہ و بازار میں

واسطے تیرے تھے ہم اک باغِ گلہائے مراد
سیر پھولوں کی تھے ہم تیرے لیے گلزار میں

گرچہ ہی طومارِ شکوہ مختصر اے جانِ من
فائدہ ہی کیا ہی لیکن اس کے اب اظہار میں

ہی ہمارا لفظ ہر اک داستانِ پُر الم
کیا سُنائیں حالِ دل دم ہی کہاں گفتار میں

الغرض گفتار اُس کی دیر تک سنتا رہا
یاد کرکے میں بھی وہ دن اپنا سر دھنتا رہا

اس طرف سے رازِ دل یوں ہو چکا جب آشکار
میں بھی یوں گویا ہوا اس سے بطرزِ اختصار
آہ! اے عصمت کی دیوی آہ! اے اُلفت شعار
تو گئی جب سے میں کھو بیٹھا ہوں سب ہوش و قرار
میں ترا تھا اور تو میری تھی دل سے غمگسار
تو مری شیدائی تھی میں تجھ پہ تھا جاں سے نثار
یہ نہ تھا جانے کا وقت اے مونسِ جانِ حزیں
کیوں نہ ہوں آنکھیں مری ہجراں میں تیرے اشکبار
تیری فرقت میں گریباں گیر ہی دستِ اجل
خارِ وحشت سے ہی یہ دامانِ ہستی تار تار

گو نہیں پیشِ نظر وہ موہنی مورت تری
داغِ دل سے ہو ترا نورِ محبت آشکار
رنج میں راحت میں تھی ہر حال میں میری شریک
تیری تسکیں سے تھی میری ہمتِ دل استوار
جب کبھی تو لطف سے ہوتی تھی گرمِ گفتگو
پھول جھڑتے تھے تری ہر بات سے اے گلعذار
حسنِ صورت سے کہیں بڑھ چڑھ کے تھا حسنِ عمل
عصمت و عفت میں تھی تو جانکی کی یادگار
پاک تھا آئینۂ دل تیرا عکسِ کینہ سے
تھا دامانِ زباں الفاظِ بد سے داغدار
پیکرِ شرم و حیا تھی تو سراپا جانِ من
تھی شبیہہ حق ترے نقشِ جبیں سے آشکار
تھا منور کلبۂ دل تجھ سے میرا شمع رو
تیرے حسنِ خلق پر صدقہ تھا میں پروانہ وار
جب کبھی پاتی تھی مجھ کو مبتلائے رنج و غم
دیکھ کر یہ حال ہو جاتی تھی از بس بیقرار
سیکھتے تھے غیر تک تجھ سے اطاعت کا سبق
تھی دل و جاں سے پتی کی اپنے تو خدمتگزار

	اتنا کہنے پر نہ جب میری تسلّی ہو گئی اس طرح گویا زباں پھر میرے دل کی ہو گئی	

تجھ پہ اے دیوی ہی میرے دل کی حالت آشکار
تیرے جاتے ہی زمانہ ہو گیا تاریک و تار
سیلِ خوں جاری ہی اب آنکھوں کے چشموں سے مرے
کام چوبِ دامن کا دیتا ہی بنا بر شعلہ بار
آہ! یہ سینہ مرا کیوں پھٹ نہ جائے درد سے
یاد جب اوصاف آتے ہیں ترے اے دوستدار
جب ذرا بے چین باقی تھی تو مجھ کو اے شفیق
آپ ہو جاتی تھی بے چین اور مضطر بے قرار
قابلِ تعریف تھی شوہر پرستی کی ادا
فرض کی تکمیل میں تھی انتخابِ روزگار
مرحبا اے ضبط و خوش خلقی کی دیوی مرحبا
خوف کھاتا تھا غضب کا دیو تجھ سے بار بار
عشقِ صادق کا پڑھایا تھا مجھے تو نے سبق ؛
تجھ سے ہی پایہ مری ہستی کا تھا با اقتدار
عمر بھر تو نے اُٹھائے رنج و دکھ میرے لیے ؛
بھول کر بھی پہلوئے راحت نہ دیکھا ایک بار

تھی تو میری ہمدمِ صادق رفیقِ دردمند
جب سے بچھڑی بوجھ ہی مجھ پر حیاتِ مستعار
بڑھ کے تھے سیم و طلا سے زیورِ اوصافِ نیک
طوق سے اچھے تھے کیا تیرے وہ خوش خلقی کے ہار
عالمِ ارواح میں بھی واہ اے جنت کی حور
بھول سکتی ہے نہ تیری روح مجھ کو زینہار
رکھ یقیں تو بھی میں اے دیوی نہ بھولونگا تجھے
دل کے مندر میں رہیگی تیری مورت برقرار
قیدِ ہستی میں نہیں رہنے کی اب باقی ہوس
کیا کروں مجبور بیٹھا ہوں یہاں بے اختیار
اس سے زائد اور کیا طالب کرے اظہارِ غم
شعر یہ اُستاد کا وردِ زباں ہے بار بار

چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

——— ٭٭٭ ———

(۲)

صبر

۷ دسمبر ۱۹۱۷ء کو پروفیسر جی۔ این۔ داس صاحب۔ ایم۔ اے کی طرف سے راقم کو ایشیا کے ملک الشعرا جناب رابندر ناتھ صاحب ٹیگور کی مشہور تصنیف "گیتانجلی" کی تین نظمیں اردو میں ترجمہ کرنے کا ایما ہوا۔ نیاز مند ان دنوں سکنڈ ایر کلاس میں پڑھتا تھا اور امتحان "منشی عالم" کی تیاری میں مصروف تھا۔ لہٰذا اردو میں تینوں نظموں کا ترجمہ کیا اور ان کی خدمت میں یہ مترجمہ نظمیں پیش کیں پروفیسر صاحب نے ان کو پسند فرمایا اور جس مطلب کے لیے ان کو درکار تھیں کارآمد ہونیکا اظہار کیا۔ کچھ عرصہ ہوا کہ مولانا نیاز صاحب فتحپوری نے "گیتانجلی" کا پورا ترجمہ اردو نثر میں شائع کیا ہے جو قابلِ دید ہے۔ چونکہ بحور و قوافی۔ ردیف اور دیگر پابندیوں کی قیود کی وجہ سے ایک زبان کی نظم کا ترجمہ دوسری زبان کی نظم میں کرنا مشکل ہو جاتا ہے مجھے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مولانا موصوف کا ترجمہ بہتر و برتر ہے۔ یہاں یہ تینوں نظمیں سلسلہ وار درج کی جاتی ہیں۔

مری ماتا دُلارے کی سواری گھر سے گذری ہے
کلس پر اس کی رتھ کے کیا کرن سورج کی نکھری ہے

چھپا کر منہ کو گھونگھٹ میں کھڑی تھی گھر کی کھڑکی پر
نظارہ ہو گیا قسمت سے اس مکھڑے کا بس دم بھر
نہ پوچھ کیا ہوا پھر کیا بتاؤں اپنی ماتا کو
ملایا اس کی خاکِ رہ میں دل کی رتن مالا کو
تجھے اے میری ماں یہ حال سن کر کیا اچنبھا ہے ؟
یہ چپ سی لگ گئی ہے کیوں تجھے اس کا سبب کیا ہے ؟
کسی نے ہار وہ میرا نہیں اب تک اُٹھایا ہے
اسے بھتوں نے توڑا اور مٹی میں ملایا ہے
ہے باقی لیک بس تھا کی نہیں ہے خاک میں کچھ بھی
نہیں جز یاس و حسرت خاطرِ غمناک میں کچھ بھی
دیا کیا میں نے اور کس کو دیا کیا تذکرا اس کا ؟
رہے گا خاک کے نیچے چھپا دائم پتا اس کا
سواری ہی اس دُلارے کی جو میرے گھر سے یوں گذری
پچھاور کیا نہ اس پر رتن مالا دل کی میں کرتی !

(۳)

شاہی بھکاری

×

ایک گاؤں میں جو میرا ایکا یک ہوا گذر
گھر سے میں بھیک مانگنے نکلی تھی در بدر

تو آئی دور سے تری سونے کی رتھ نظر   اِک شاندار خواب تھا گویا کہ جلوہ گر
منظر یہ میں نے دیکھا تو حیران رہ گئی   راجوں کا راجہ کون تھا آخر تھا یہ کوئی؟
میری امیدیں بڑھ گئیں گویا تھی شاہ کا ؟   سوچی بُرے دن اپنے نگر ہو گئے تمام
بے مانگے میں کھڑی رہی خیرات کے لیئے   دولت کی خاطر اور مدارات کے لیئے
رتھ تیری ٹھہری میں تھی جہاں پر کھڑی ہوئی   اور تو اُتر پڑا جو نہی مجھ پر نظر پڑی
سمجھی تھی میں کہ میرا بھی جاگا نصیب آج   بن جائیگی امیر یہ بندی غریب آج
پھر تو نے اپنے ہاتھ کو باہر نکال کر   فرمایا لا دے پاس تو رکھتی ہی کچھ اگر
تیرا یہ بھیک مانگنا ایسے فقیر سے   امید رکھنی ایسے غموں کے اسیر سے
آخر ہنسی مخول کا کیا اشتیاق تھا   یہ دل لگی تھی یا کوئی شاہی مذاق تھا
حیرت کی میری اُس گھڑی کچھ انتہا نہ تھی   تھی بے حواس اور طبیعت رسا نہ تھی
تب میں نے اپنی جھولی میں ڈالی جو اک نظر   تھا اس میں غلہ دانہ دیا اک نکال کر
حیرت ہے سخت کیا کیا کہوں کس طرح بھی ہوا   حیرانی ہو رہی ہے مری دم بدم سوا
جھولی جو جھاڑی شام کو تو یہ پتہ چلا   سونے کا ٹکڑا ہی وہاں دانہ جہاں وہ تھا
رونے لگی میں دیکھ کے یہ حال زار زار   اے کاش تجھ کو سب ہی میں دے سکتی ایکبار

(۴۳)

مبارک وقت

مری ماتا وہ راجا کا دُلارا آج آئے گا   گزر کر سامنے سے اب ہماری گھر کے جائے گا

بتا مجھ کو کہ پھر میرے لیے یہ کیسے ممکن ہے !
ذرا مجھ کو بتا کس قسم کی پوشاک میں پہنوں ؟
مگر اے پیاری ماتا کچھ تو کہہ یہ کیا ہوا مجھ کو ؟
ابھی جا کر میں کمرے میں دریچے کے جو بیٹھونگی
سمجھتی ہوں کہ ہرگز وہ مری جانب نہ دیکھیگا
گزر کر جب ہمارے گھر سے وہ آگے کو جائیگا
جو مجھ تک کوئی شے پہنچی تو باجے کی صدا ہوگی
مگر پیارا دریچہ خانہ سے ہو کر جب گزر جائے
یہ ملنا گو ہمارا ایک ملنے کے لئے بیجا ہو
رہوں مشغول گھر میں یوں مبارک دن ہے کیا دن ہے !
سنواروں کس طرح سے بال کس انداز سے بیٹھوں !
خموشی اور حیرت سے تو کیوں ہو دیکھتی مجھ کو ؟
نگاہِ شوق سے پیارے دلارے کو میں دیکھونگی
نظارہ ہو تو دم کی دو میاں سے جب وہ گزریگا
ذرا بھی دھیان میرا اس کو رستہ میں آئیگا
اثر سے جس کے درد انگیز گیتوں کی ادا ہوگی
تو کیا مجھ کو ملبس اپنی سج دھج سے نہیں ہونا
مجھے لیکن لباس نو پہننے کی اجازت دو

خیر مقدم جناب سر ڈاکٹر تیج بہادر سپرو

ماہ ستمبر یا اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء میں سر ڈاکٹر تیج بہادر صاحب سپرو ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ کے۔ سی۔ ایس آئی کو ایک مقدمہ کی پیروی کرنے کے لیے کشمیر تشریف لانا پڑا۔ چونکہ صاحب موصوف ایک [illegible] اپنے وطن مالوف میں آ گئے۔ لہذا اہل برادری پنڈتان [illegible] کی طرف سے دوران قیام میں پنڈت آنند کول صاحب [illegible] کے مکان پر ایک ٹی پارٹی میں مدعو کیے گئے

جلسہ نہایت بارونق تھا اور اس میں ریاست کے بڑے بڑے اہلکار اور معزز اصحاب و رؤسا سب شامل تھے۔ راقم سے بھی ان کے خیر مقدم پر ایک نظم لکھنے کا ارشاد ہوا۔ چنانچہ ذیل کا مسدس اسی موقع کی یادگار رہی۔ پنڈت صاحب موصوف کو یہاں سے جا کر وائسرائے ہند کے لیجسلیٹو ڈپارٹمنٹ کی ممبری کا چارج لینا تھا۔ جس کا اشارہ نظم میں موجود ہے۔ مختلف قسم کی تقاریر ہونے کے بعد آپ نے قوم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک نہایت شستہ اور فصیح تقریر کی جس میں آپ نے اپنی طرف سے ہمدردی اور تمام واجبی امداد دینے کا اطمینان دلایا علاوہ چائے مٹھائی وغیرہ کے ساز و سرود کا سامان بھی کافی طور پر پہنچایا گیا تھا جلسہ تین چار گھنٹے کی کارروائی کے بعد برخاست ہوا۔

بہت مدت میں بدلا آج رنگِ انجمن اپنا بنا گلزارِ جنت کا نمونہ کیا چمن اپنا	بنا دارِ مسرت آج یہ بیت الحزن اپنا ہر رنگِ گل نظر آتا ہے ہر خار وطن اپنا

نئی جاں آ گئی ہے وادیٔ کشمیر کے تن میں
بہارِ تازہ آج آئی ہے کیا اس کہنہ گلشن میں

نوید روح افزا آج کیا بادِ صبا لائی کنول دل کا کھلا ہے اور طبیعت جوش پر آئی	کہ جس سے گلشنِ دل نے [illegible] در و دیوار پر بارش ہے مسرت کی [illegible]

کھلی شامِ غریباں آج کیا صبحِ وطن ہو کر
خزاں آئی ہے اب کے رونق افزائے چمن ہو کر

ہمارے بھاگ جاگے وہ یہاں تشریف لائے ہیں
جو ملنے کے لیے بچھڑے ہوؤں سے آج آئے ہیں
کہ جن کے خُلق کے مدّاح سب اپنے پرائے ہیں
کشش سے جذبِ دل کی کھینچ کر ہم انکو لائے ہیں

جو حُبِّ قوم کا عنصر تمہارے دل میں پاتے ہیں
تو ہر ہر گام پر اہلِ وطن آنکھیں بچھاتے ہیں

وطن میں افتخارِ قوم کا آنا مبارک ہو
دلوں میں پھر وطن کا دھیان لانا مبارک ہو
قدمبوسی کی عزت قوم کو پانا مبارک ہو
ہوائے دید سے ہر دل کا کھلنا مبارک ہو

مبارک یہ گھڑی ہے اور ہمایوں ایسی ساعت ہے
وطن - اہلِ وطن میں دم جو کٹ جائے غنیمت ہے

تمہارے تیج سے کُل ہند میں پھیلا اُجالا ہے
تمہارا کشورِ ہندوستاں میں پایہ اعلیٰ ہے
یہ کشمیر بھی اک فخر تم پر کرنے والا ہے
تمہارے خلق کا چھوٹا بڑا شیدا و والا ہے

اور اس عظمت پہ وہ سادہ طبیعت تم نے پائی ہے
ملیں چھوٹوں سے اس میں کچھ بڑوں کی ہی بڑائی ہے

ہمارا گھر ہمالہ میں ہمالہ برف کا گھر ہے
نہ لیکن سرد مہری سے ہمارا دل موثر ہے

جہاں چاندنی جھیلوں اور چشموں کا ہی منظر ہے
یہ دل اپنا نہ ٹھنڈی گرمیاں کر نیکا خوگر ہے

محبت کی ہمارے دل میں ایسی آگ جلتی ہے
کہ جس کے سوز سے برف اور یخ تک بھی پگھلتی ہے

اسی سے شادکامی کا سماں وہ آج چھایا ہے
تمہارا چہرۂ پر نور جس نے دیکھ پایا ہے

کہ جس نے کلفتِ دوراں کا غم دل سے بھلایا ہے
وہ پھر فرطِ مسرت سے نہ آپے میں سمایا ہے

تمہاری صحبت نے طرزِ دل محزوں سنواری ہے
یہ سمجھے ہم کہ اس خطہ پہ لطفِ فضلِ باری ہے

یہاں سے جا کے تم اونچی کرسیِ عزت پہ بیٹھو گے
تقاضا ہے امنِ ملکِ ہند کا بار اپنے سر لوگے

جہاں سے نائبِ شاہ جہاں کو مشورہ دو گے
مگر امید ہے ہم کو نہیں دل سے بھلا دو گے

تھی تختِ مصر پر یوسف کو جیسی یاد کنعاں کی
وطن کی یاد کو رکھنا یونہی دل میں جگہ تم بھی

۶

انقلاب

۸ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء کو راقم کے دوست پنڈت دینا ناتھ صاحب دلگیر اختر کی ایک غزل کی نقل لائے اور پڑھ کر سنانے لگے۔ چونکہ پنڈت صاحب خود بھی مذاقِ سخن رکھتے ہیں۔ اس کی داد دینے لگے۔ بلکہ ساتھ ہی اس کے فرمایا مجھے یہ غزل پسند ہے۔ آپ اس پر مصرعے لگائیے ہر چند راقم نے معذرت چاہی اور ایسی غزلوں پر تضمین کرنے سے نفرت ظاہر کی۔ مگر وہ اپنے اصرار سے باز نہ آئے اور قلم۔ دوات اور کاغذ لیکر سامنے بیٹھ گئے۔ ایک ایک شعر پر ایک ایک بند طلب کرنے لگے تو ناچار بحالتِ مجبوری اس کی تعمیل کی یہ مخمس کچھ دنوں کے بعد رسالۂ طریقت لاہور میں طبع ہوا۔

گردشِ ایام نے کیسا دکھایا انقلاب
ہو گئی عنقا فراغت اُڑ گیا آبی خضاب
ہو گئے بگلے کے پر جو بال تھے بالِ غراب
آ گئی پیری کی شب جاتا رہا روزِ شباب
دست و پا بیچارگی سے دے چلے ہم کو جواب

یادِ جاناں نے ہمیں رکھا کبھی وقفِ عذاب
جھونپڑی میں رہ کے محلوں کے کبھی دیکھے ہیں خواب

دھوکے کی ٹٹی ہے دنیا در حقیقت اے جناب
جس کو ہم دریا سمجھتے تھے نظر آیا سراب
جس کو ہم اچھا سمجھتے تھے اُسے پایا خراب

خوابِ غفلت میں بسر امروز تا فردا ہوئے
کچھ نہیں آتا سمجھ میں کیا تھے کیا سے کیا ہوئے
ضعف غالب ہو گیا بیکار سب اعضا ہوئے
عیش و عشرت مٹ گئے رنج و الم پیدا ہوئے
ہائے دورِ زندگی میں آ گیا کیا انقلاب

سُن کے پیغامِ اجل دنیا کا بندہ ڈر گیا
عیشِ فانی پر ہوا شیدا کہ جیتا مر گیا
ہائے بختِ تیرہ اپنا جام آخر بھر گیا
نور آنکھوں کا اڑا اندھیر کیسا کر گیا
پانی پانی ہو گئی حسن و ادا کی آب و تاب

چین دنیا نے نہ میرے قلب کو دم بھر دیا
لعل جب مانگا تو بس اس کے عوض پتھر دیا
فیصلہ ہی یہ کسی نے خوب ہی تجھ پر دیا
گردشِ ایام نے ہم کو یہ ثابت کر دیا
خواب ہیں سب کارِ دنیا بلکہ دنیا بھی ہے خواب

رو پڑا میں تو کہا یہ بھی بہانہ اک سہی
میری میت پر کہا تو یہ کہ کیوں جاں اس نے دی
حسب عادت کہدیا جو بیقراری دل میں تھی
رحم آیا میری حالت پر جو غیروں کو بھی
یار کو اس رحم سے اغیار پر آیا عتاب

یوں تو میرے نام سے واقف نہ تھا کوئی بشر
ہے دو رنگی میں پھنسایا طالع بد نے مگر
بیکسی نے حال میرا کر دیا سب مشتہر
جو نظر رکھتا تھا میرے حال پر شام و سحر
پھر گئیں آنکھیں اسی کی ہے یہ کیسا انقلاب

ہم گرفتار مرض ہیں اور نہیں ملتا طبیب
ہیں کہاں وہ ہم ہی نہیں دیوار کا سایہ قریب
ہو گئی خوش قسمتی عنقا ہوئی راحت نصیب
شوم بختی ہیں کہاں ظل ہما ہم کو نصیب
سر پہ منڈلاتا ہے اب تو عشق کا ہر دم عقاب

مہر خاموشی ہے لب پر ہو گئی حالت عجیب
اب ہوا ثابت کہ ہے بے فائدہ دست طبیب
کر نہیں سکتا عیاں راز دروں کوئی حبیب
تم ملے جس دن تو ہم سمجھے کہ اب جاگا نصیب
ہجر میں جانا کہ ہم نے خواب میں دیکھا ہے خواب

گا ۔ ہم بڑھتے رہے گھٹتے رہے طالب گئے
منزلِ دنیا میں دائم ہم تو سرگرداں رہے

وائے بدبختی کہ دل سے خون کے چشمے بہے
کس قدر درد و الم کے آج تک صدمے سہے

آج تک آیا نہ اے اختر ہمیں اس کا حساب

سکاوٹ بچوں کا گیت

سال گزشتہ کے ماہ دسمبر میں سری نگر میں سکاوٹنگ کا ایک تماشی جلسہ منعقد کیا گیا۔ کئی سکاوٹ ماسٹروں کے اصرار پر سکاوٹ بچوں کے لیے ذیل کا گیت لکھا گیا تھا۔

آجاؤ نوجوانو مجلس بنائیں اپنی
وہ کام کر دکھائیں ہو جس سے نام پیدا
سستی و کاہلی کو یکلخت چھوڑ دیں ہم
ہو نظر ہر دم امداد بیکسوں کی
ہر بات میں ہماری پنہاں ہو راز خدمت
ہمت دلا رہی ہے آمد یہ سال نو کی

اک شانِ دلفریبی پھر ہم دکھائیں اپنی
اور جوشِ دل سے ہم کریں اک خیرِ عام پیدا
ناکامیوں کو ہمت سے توڑ دیں ہم
غربت زدوں کی حالت اچھی بنا کے سوچیں
بہبودِ ملک ملت ۔ ہمدردی و محبت
ہر سو ہو شادمانی گائیں خوشی میں ہم بھی

تاثیر ہو الٰہی ہر کام میں ہمارے | کشمیر میں ہمارے خرم ہوں لوگ سارے

الوداعی نظم

ماہِ جنوری ۱۹۲۱ء میں پنڈت بھو ورز تشی صاحب بی۔ ایس۔ سی۔ سرکاری وظیفے پر بغرض تحصیل علم و تربیت (کان و معدنیات) امریکہ بھیجے گئے تاکہ وہاں سے آکر اس ڈپارٹمنٹ میں مفید ثابت ہوں آپ پہلے کشمیری پنڈت ہیں جو اس طرح سے تحصیل علم کی خاطر ہندوستان سے باہر تشریف لے گئے۔ آپ کی روانگی پر آپ کو چند احباب کی طرف سے ایک الوداعی پارٹی میں دعوت دی گئی۔ خاکسار سے ایک نظم لکھنے کا ارشاد ہوا چند دنوں سے کچھ خیالات ذہن میں جاگیر تھے ان کو نظم کی صورت میں ترتیب دیکر وہاں پڑھ کر سنایا۔

طالبِ محزوں سرِ بستر جو محوِ خواب تھا | صبحدم وقتِ طلوعِ مہرِ عالمتاب تھا
آگئی بادِ صبا اتنے میں اتراتی ہوئی | چار سو وہ جانفزا خوشبو میں پھیلاتی ہوئی
دستِ نازک سے جگانے یوں لگی کہکر مجھے | جاگ اے ہمدم نہیں کیوں ہوش ہے آتا تجھے
اٹھ کہ ہے اب چاک ہو جا بکو دامانِ سحر | جلوہ فرما ہونیوالا ہے زر افشانِ سحر
اٹھ کہ باغِ دہر میں ہے نوبہار آئی ہوئی | اور اب تک تجھ پہ غفلت کی گھٹا چھائی ہوئی

دم بخود کیوں ہو گیا ہے تو رضائی تان کر ؟
خوشنوائی سے تو پہلی تھی پیدا شان کر

یاد ہیں وہ دن ہیں تو ہم نوا بلبل کا تھا
باغ سے الفت تھی شیدائی گل و سنبل کا تھا

آہ تو اب کس لیے حسرت سے ہم آغوش ہے ؟
کیا ہوئی وہ خوش بیانی ہائے کیوں خاموش ہے ؟

اٹھ ذرا بے اعتنائی سے نہ ہرگز کام لے
دیکھ دنیا کی ہوا چشم بصیرت کھول دے

سال نو کا مجھ سے اقرار مبارکباد کر
دل کو تو فرحت ہو اک کاشانہ آباد کر

صبحدم جو کان میں ایسی صدا آتی رہی
چونک اٹھا خواب سے سستی مری جاتی رہی

دیکھتا کیا ہوں جو گرد اپنے نظر میری پڑی
تھی نسیم صبحگاہی کی پری سر پہ کھڑی

یوں ہوا گویا میں اس سے کیوں ستایا ہے مجھے ؟
راحت خواب گراں سے کیوں جگایا ہے مجھے ؟

باعث تسکین دل کیا عالم گلزار ہو ؟
جب وطن کی حالت ابتر سے یہ بیزار ہو ؟

دن ہیں جاڑے کے دکھائیگی مجھے کیا سیر باغ ؟
دیکھکر دل قوم کی حالت ہوا ہے داغ داغ

رونا آتا ہے زوال ملک پر بے اختیار
اک بہار قوم پر لاکھوں بہاریں ہوں نثار

حال میں اے ہمنفس اپنا بتاؤں کیا تجھے ؟
داغ اس حسرت بھرے دل کے دکھاؤں کیا تجھے ؟

خانہ بربادی کو اپنی دیکھ کر اے مہرباں
پاؤں میں میرے پڑی ہیں رنج و غم کی بیڑیاں

کیوں نہ آؤں میں نظر یوں بے بس و بیکس غریب ؟
شاد کیا ہوں جب نہ اپنی قوم کا جاگے نصیب ؟

ہو مبارک تجھ کو ہی اس سال کی تازہ بہار
ہم نے ایسے سال نو کے ہیں دیے برسوں گذار

جب سنا باد صبا نے یہ تو بتلایا مجھے
اک نوید جانفزا اے ہم سناتے ہیں تجھے

سر میں تیرے خبط ہے آنا نہ تو بیتاب ہے
اٹھ شریک بزم عشرت ہمرہ احباب ہے

بزم وہ سب جس میں یاران وطن آجائنگے
اور اک نوید وطن اعزاز رخصت پائنگے

جائنگے وہ منزلیں ہیں گو سفر کی کچھ کٹھن
سیکھ کر آئینگے امریکہ سے لیکن علم و فن

کیا یہ کچھ کم مژدہ ہی تیری مسرّت کے لیے ؟ | کیا ذریعہ یہ نہیں ہی قومی عظمت کے لیے ؟
یہ نوید جانفزا سُن کر میں مسرتا ہو گیا | نیم مردہ تھا میں دل میں ولولہ پیدا ہوا
ایسی حالت میں یہ بندہ تاب لا سکتا نہ تھا | ایک دم جلسے میں شامل ہو کے یوں گویا ہوا
ایک شاعر کے سخن میں کچھ اگر تاثیر ہے | اور کچھ وقعت کے قابل اس کی گر تحریر ہے

لے دعا اس طالبِ ناچیز سے اے جانِ من
ہو مبارک یہ سفر اے با سر و سامان من

(۹)

شاعرانہ انقلاب

۲۱- اپریل ۱۹۲۱ء غیر مطبوعہ[1]

ایک دن وہ تھا کہ کھلتا رنگِ بستاں دیکھ کر
وجد کرتا آمدِ ابرِ بہاراں دیکھکر
دل مرا بانسوں اُچھل جاتا تھا پہلو میں کبھی
پردۂ تصویر میں رخسارِ جاناں دیکھکر
نرگسِ شہلا سے ہیں آنکھیں لڑاتا تھا کبھی
مست جامِ گل تھا شکلِ جامِ عرفاں دیکھکر
جی بہل جاتا تھا سیرِ سنبلستاں سے کبھی
دل کی کھلتی تھی گرہ زلفِ پریشاں دیکھکر
تھا تصوّر میں ثریّا کے کبھی اختر شمار
چشمِ گریان وبیانِ سلکِ دنداں دیکھکر
شوق سے پڑھتا تھا حسن و عشق کی میں داستان
جی کو بہلاتا سخن سنجوں کے دیواں دیکھکر

[1] یہ نظم میرے مہرباں دوست قاضی سیف الدین صاحب مستی فاضل لیڈر ... کول صاحب ناسخ کی پنڈت شمبھو ناتھ صاحب ... بی اے ایل ایل بی وکیل اور پنڈت دینا ناتھ صاحب چکبست نے بہت پسند کی تھی (طالب)

رس لیلا کا سماں آنکھوں میں پھرتا تھا مری
ہجر میں گوپال کے رادھا کو نالاں دیکھکر
یاد میں محبوبِ دلجو کی مثالِ راجہ نل
کھل گئیں آنکھیں مری خوابِ پریشاں دیکھکر
ہاتھ سے جاتا تھا دل سنتا تھا جب میں بزم میں
غش ہوا عاشق کسی کا رہ رُے ناباں دیکھکر
چٹکیاں لیتا تھا پہلو میں یہ قلبِ فتنہ جو
بت پرستی شوخیٔ طبع جواناں دیکھکر
دل امنگوں سے بھرا تھا شوخ تھا اور چلبلا
خوش تھا کوئے یار کو میں محرِ شستاں دیکھکر
یاد میں لعلِ لبِ رنگیں کی دل تھا باغ باغ
رونقِ رنگینیٔ لعلِ بدخشاں دیکھکر
عاشقی کو کھیل بچوں کا سمجھ بیٹھا تھا میں
ظاہر آبادِ طرازِ عشق بازاں دیکھکر

حق میں اپنے ہو گئی ثابت یہ ٹیڑھی کھیر ہے
عاشقی بھی زندگی کے خواب کی تعبیر ہے

آج وہ دن ہی میسر آشنا ہوتا نہیں
اِن گلوں میں جلوہ گر رنگِ وفا ہوتا نہیں

رمز سے نا آشنا ہوں عشق صادق کی ہنوز
حق لطفِ خود شناسی بھی ادا ہوتا نہیں

دل بتوں کے عشق میں اُف ہو گیا پتھر سخت
اب کسی بے مہر سے پیا آشنا ہوتا نہیں

خواب ہی میرے لیے اب حُسنِ رنگیں کی بہار
محوِ آرائش مرا وہ دلربا ہوتا نہیں

بس شکستِ آرزو ہی کاروانِ یاس میں
یہ جرس وہ ہی کبھی جو با صدا ہوتا نہیں

ولولے جوشِ جنوں کے یک بیک رخصت ہوئے
اب تو حاصل دل کا اک بھی مدعا ہوتا نہیں

اب طبیعت میں رہا باقی نہ وہ سوز و گداز
آہ میں طاقت نہیں نالہ رسا ہوتا نہیں

دل بہلتا ہے نہ اپنا شوخیٔ انداز سے
قبلۂ دِل مہبطِ ناز و ادا ہوتا نہیں

خود فراموشی سے ہی دامانِ تمکین تار تار
مانعِ وحشت سرِ شرم و حیا ہوتا نہیں

اب کہاں وہ آبشارِ دیدۂ گریاں بجوش ؟
چشمۂ بے فیض مصروفِ فنا ہوتا نہیں

اب وہی دل ہی کہ حسرت کا بنا آماجگاہ
خستگی دلدادۂ جویائے دوا ہوتا نہیں

زندگی ہے تلخ اپنی گردشِ ایام سے
حق میں اپنے رحمت و فضلِ خدا ہوتا نہیں

اب نہیں بھاتی مجھے یہ غنچہ و گل کی مہک
میں رہینِ منتِ بادِ صبا ہوتا نہیں

تھا کہاں کا عشق میں نقلی مگر دیوانہ تھا ؟
"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

حسرتیں ساری یکایک دل میں نہاں ہو گئیں
بن گئے سیلاب آنسو آہیں طوفاں ہو گئیں

شکوۂ جورِ فلک کب ہی مگر افسوس ہے
درد اپنے حق میں کاوش ہائے مژگاں ہوگئیں
قید کر سکتا نہیں ہم کو کبھی زندانِ زلف
بیکسی کی بیڑیاں زنجیرِ زنداں ہوگئیں
یہ سُنا تھا بت پرستی سے بنینگے حق پرست
محو ہیں ایمان کی سب ندیر ایماں ہوگئیں
ہوگیا ہے جوشِ وحشت سے تفنن ہمردیف
آرزوئیں خندۂ چاکِ گریباں ہوگئیں
بند رکھتا ہے زبانِ التجا شوقِ سکوت
اپنی پُرحسرت نگاہیں چشمِ حیراں ہوگئیں
یاد تک آتی نہیں اب وہ پُرانی محفلیں
ساری اگلی صحبتیں خوابِ پریشاں ہوگئیں
اب وہ سودائے محبت سر سے ہی جاتا رہا
ہمتیں رنج و الم سے پابجولاں ہوگئیں
بھول بیٹھے ہیں ادائے نالہائے جانگداز
جتنی فریادیں تھیں وقفِ نازخوباں ہوگئیں
بندۂ عشق و جنوں کو کیا سزا کیسا عذاب؟
حسن کی نیرنگیاں تکفیلِ عصیاں ہوگئیں

حلقۂ زنجیر پر ہی چشمِ آہو کا گماں ؛
گردشیں صحرا کی اپنے حق میں زنداں ہو گئیں

حُسن کا شیدا دلِ رم خوردہ اب ہوتا نہیں
حسرتیں دل کی مرے گھر کا بیاباں ہو گئیں

چشمِ غفلت گوہرِ مقصود پر تھی جاں نثار
گردشیں دوراں کی مثلِ ابرِ نیساں ہو گئیں

تھا فریبِ عشق کاذب یا حسینوں کی تلاش
دل مچل جاتا مرا جھوٹی نمائش پر نہ کاش



(۱۰)

رباعیات

راقم نے رباعیات بہت کم لکھی ہیں۔ ان میں سے دو تین رسالہ "پریم بلاس" گوجرانوالہ میں شائع ہوئی تھیں اور ماہ نومبر ۱۹۱۵ء میں لکھی گئی تھیں

ہم آکے جہان میں کیا سیہ کار ہوئے بجتے نہ قمار میں جہاں کے طالب	غفلت کی شراب پی تو میخوار ہوئے عقبےٰ کے گلے کا رنج سے ہار ہوئے
دنیا تو وبالِ جاں ہے پیری کے لیے طالب پیری میں کب کوئی ساتھ چلے	ہے خواہش پرواز اسیری کے لیے ہاں ایک عصا ہے دستگیری کے لیے
سنسار میں کوئی بھی انکو نام نہیں بن باس بھی لے کے سکھ نہ پایا طالب	بستی کا اس اجڑے ملک میں کام نہیں سچ ہے کہ یہ دہر جائے آرام نہیں
سکھ چین سدا دستِ کرم دیتا ہے بدخواہ کا بھی منزلِ آخر میں ساتھ	گلزارِ جفا خارِ الم دیتا ہے ہے مرد جو دو یار قدم دیتا ہے
دلدادہ مشوقِ سخن ہو گیا جب سے توبہ سے نہ کیوں ہو ظلمتِ عصیاں دور	بیمار پڑا رہتا ہوں بستر پہ میں تب سے "خورشید نکلتا ہے سدا پردۂ شب سے"
خدمت ہے کونسی جو حکومت کی کی نہیں ناحق شناس لوگ ہیں طالب غضب ہے	تھا کونسا وہ حکم کہ جاں جس پہ دی نہیں کرتے خطاب ہم کو بھی آئی اسی نہیں

شیش آزادانہ نوارستہ ہے یہ سو لبریشن ہے
جو ہوں پابندِ دیں تو کہتے ہیں یہ اولڈ فیشن ہے
نہ گھر اور گھاٹ کی رہتی ہے اس الجھاؤ میں طالب
سگِ گازر سے بھی کچھ بڑھ کے ہندوستاں کی نیشن ہے

اس طلسماتِ جہاں میں گرچہ اک نیرنگ ہوں
خط کے آنے سے ترے اے سادہ رو دلتنگ ہوں
ٹکٹ دو تو کھل کے بیٹھوں ورنہ ہے میرا سلام
میں عزیزو ڈاک خانہ کا خطِ بیرنگ ہوں

(۱۱)

تضمین بر غزلِ حافظ شیرازی

۸ جنوری ۱۹۱۶ء غیر مطبوعہ

در دلِ ما خاکساراں حبِ مال و جاہ نیست — با طریقِ اہلِ دنیا ہیچ رسم و راہ نیست
شمع ساں سوز دروں سوخت مرا آتشِ غیب — زاہدِ ظاہر پرست از حالِ ما آگاہ نیست
در حقِ ما ہر چہ گوید جائے ہیچ اکراہ نیست

جملگی جهل است ای دل معرفت گر غیر اوست   همچو کعبه در حقیقت مظهر حق در بر اوست
ره ماندگی چون در شریعت مظهر اوست   در طریقت هر چه پیش سالک آید خیر اوست

در صراط المستقیم ای دل کسی گمراه نیست

یافته مقصد کسی کو صفوت فکرت بجو اند   هر که بگذشته ازین هم خیره و حیران بماند
فیل بندم ساخته گردون و در صنعم نشاند   تا چه بازی رخ نماید بیدقی خواهیم راند

عرصهٔ شطرنج رندان را مجال شاه نیست

رحم ای بی مسمی گر سر و دستار اشکست   من نمیدانم بلندی چیست یا پستی چه چیست
سوز غم کردم کباب الا زبان شکوه بست   اینچه استغناست یارب وینچه داور حاکم است

کاین همه زخم نهان است و مجال آه نیست

گشت تا آئینهٔ دل زآتش رخسار نقش   میکند در سینهٔ من شعله های نار نقش
جلوت این صحن زمین بس بی همه هموار نقش   چیست این سقف بلند و ساده و بسیار نقش

زین معما هیچ دانا در جهان آگاه نیست

از شمار فعل بد افتاده ام در اضطراب   وای ناکامی اگر پرسند در محشر جواب
همچو فرد دفترم افتاده اندر انقلاب   صاحب دیوان ما گویا نمیداند حساب

کاندرین طغرا نشان حسبةً لله نیست

ما فقیران را نباشد احتیاج نان جو   رزق ما فضل الهی هست هان طامع مشو
هست در هر باب این در باز ای غافل شنو   هر که خواهد گو بیا و هر که خواهد گو برو

گیر و دار و حاجب و دربان درین درگاه نیست

از شراب معرفت سرشار زاهد جام ماست — سعی در تحصیل حاصل شوق طبع خام ماست
همت عاشق معین در کار صبح و شام ماست — هر چه هست از قامت ناساز بی اندام ماست
ورنه تشریف تو بر بالای کس کوتاه نیست

گوهر مقصد به جیب همت مردان بود — حاصل منزل همه در عالم امکان بود
باده خوردن نشه ناوردن کجا آسان بود — در در میخانه رفتن کار یکرنگان بود
خودفروشان را به کوی میفروشان راه نیست

دل ز وصل ماه رویان بیقرار و صابر است — چون کنیم ای دوستان بر ما قدر حاکم است
گر کسی باشد که در این راه چون من قائم است — بندهٔ پیر خراباتم که لطفش دائم است
ورنه لطف شیخ و زاهد گاه هست و گاه نیست

طالب از یابند حق بیند ز عالی همتی است — گر غنا در فقر می بیند ز عالی همتی است
هر طریق خواجه بگزیند ز عالی همتی است — حافظ ار بر صدر ننشیند ز عالی همتی است
عاشق دردی کش اندر بند مال و جاه نیست

———*✲*———

(۱۲)

فارسی غزل

اس غزل کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ ۴۲

مدتے گذشت من بہ انتظار افتادہ ام
ساقیا رطل گراں دہ در خمار افتادہ ام

آہ من افلاک را سینہ شگافد بوالعجب
منکہ در خاکِ رہ الفت نزار افتادہ ام

کے نوا خم من احیائے فروغ بزم داد
مثلِ برگِ زرد اندر لالہ زار افتادہ ام

حرفِ الفت نقش گردید است بر سیمائے ہیچ
تا من اندر خاک و خوں در اضطرار افتادہ ام

تو تیا ہستم حیا ہستم نہ دیدہ اشک لیک
مے ندانم چوں ز چشم آں نگار افتادہ ام

از نگاہ و دوکے بیا ساند مرا پائے طلب
مثلِ آبِ سیل من از کوہسار افتادہ ام

بلبلا بر طالب بے وفا خندہ مزن
سبزہ آسا گرچہ من بیگانہ وار افتادہ ام

تقریظ تحفۂ جاوید

یعنی

تذکرۂ ہزار داستان مولفۂ لالہ سری رام صاحب ایم اے دہلوی

طبیعت ایک دن تھی شاد میری — کسی کے طلب میں تھی یاد میری
کسی کا دھیان تھا دل میں سمایا — کسی کی یاد نے تھا گدگدایا
نظر میں تھا رخِ انور کسی کا — تصور تھا وہ سیمیں بر کسی کا
وہ مستانہ روش۔ شوخی۔ شرارت — وہ دل کو چھین لینے کی مہارت
جوانی کی طرح اٹھنا کسی کا — بڑھاپے کی طرح جھکنا کسی کا
وہ دزدیدہ نظر وہ عشوہ بازی — وہ آشوبِ جفا جادو طرازی
وہ شوخی میں ادا بانکی کسی کی — حیا سے وہ نظر نیچی کسی کی
وہ دینِ زاہدی و پارسائی — وہ ایمانِ جنون و بینوائی
وہ عشوے دلربا۔ دلکش کسی کے — وہ جادو خوشنما۔ موہن کسی کے
کتابِ صنعتِ صانع کی تفسیر — عروسِ شانِ خدائی کی وہ تصویر
تصور میں مرے جیتی نظر تھی — نگاہوں میں بصیرت مری بھی
کیا قصہ بیاں اس درجہ من میں — لگا دی آگ میرے تن بدن میں
تڑپ اٹھا میں مارے درد کے پھر — لگا دم بھرنے وہ سر درد کے پھر

بڑھی بے طرح میری بے قراری
فزوں تھی آہ و زاری انکساری

بہ رنگِ چرخ بدلی میری حالت
پریشانی بڑھی کاکل کی صورت

مرے دل پر جنوں کا رنگ چھایا
کسی کو ہو پری کا جیسے سایہ

کبھی مرہون تھا فرزانگی کا
کبھی ممنون تھا دیوانگی کا

نہ اس عالم میں کچھ دنیا دکھائی
وہی صورت تھی آنکھوں میں سمائی

مجسم بن گئی فوراً وہ صورت
سراپا موہنی کی تھی وہ مورت

نہ عکسِ وہم تھا۔ محبوب اپنا
ڈھلا تھا۔ نور کے سانچے میں پُتلا

رہے قائم نہ اس کو دیکھ کر ہوش
رہا میں مثلِ بت بے حس و خاموش

ہوئی رخصت بدن سے طاقت و تاب
وہ بیہوشی تھی یا تھا عالمِ خواب

ہوئی بیخودی جب مجھ پہ چھائی
تو درد انگیز یہ آواز آئی

سنبھل اے طالبِ دیدارِ جاناں
نہ ہو مایوس ہرگز اور ہراساں

سنبھل جا ضبط سے ہاں کام لے اب
نہ کچھ رنج و تعب کا نام لے اب

نہ رہ پابندِ غم آزاد ہو جا
نوید وصل سے دلشاد ہو جا

پھر آخر کر کے یوں میری مدارا
کیا اک باغ کی جانب اشارا

دلایا شوقِ گلزارِ معانی
کہا یہ ہو ریاضِ نکتہ دانی

ادھر آ بیچ سب پیرا ٹنائیں
تجھے راہ اس گلستاں کی دکھائیں

وہاں جائیگا تو سامانِ راحت
کہ ہو وہ باغ رشکِ باغِ جنت

پھڑک اٹھا یہ سنتا رہ فردہ
کیا ہمراہی کا اس کی ارادہ

چلا میں ساتھ اس کے سایہ آسا
چلے دریا کی جانب جیسے پیاسا

دکھایا پھر مجھے وہ باغِ موعود
کرم فرما تھی جس پر ذاتِ معبود

نہ چشمے تھے نہ نہریں اس میں جاری
کہ آبِ شعر سے تھی آبیاری

چمن تھا پر نہ طائر نغمہ زن تھے
نوا زن شاعرِ شیریں سخن تھے

غرض دیکھا نرالا باغ میں نے
شگفتہ پائے دل کے داغ میں نے

بہت تھے لوگ اس میں جلوہ افگن
ادیب و نکتہ سنج و صاحبِ فن

نہایت شان سے تھے محفل آرا
کمال ان کا سراپا آشکارا

کہیں کرسی نشیں تھے میر و سودا
کہیں سوز اور جرات درد و انشا

کہیں تھے حاتم و تاباں و ناسخ
کہیں مومن - اسیر و برق و راسخ

نصیر و آرزو رنگیں کہیں تھے
حیا و ذوق و غالب ہمنشیں تھے

امیں و آتش و احسان و انور
دبیر و صابر و مشتاق و جوہر

نظیر و شیفتہ و رند و ساقی
ذکی مجروح تھے باہم ملاقی

ظہیر و باسط و ارشد تھے کسی جا
وزیر و رشک و شکی رونق افزا

نسیم لکھنوی بھی جلوہ گر تھے
حسن سالک صبا آئے نظر تھے

ادیب و احسن و شوکت ہما
نسیم دہلوی معروف یک جا

کہیں آزاد و حالی رہبر دربار
امیر و داغ و ابر اور شوق و سرشار

کہیں تسلیم و اکبر تھے خراماں
جلال و ناقب و شاکر سخنداں

افق نوح اور نظم ہمداستاں
ثمر ورد و فوق و ناظم وہاں تھے

کہیں اقبال و کیفی حسرت و شیدا
کہیں چکبست و بیخود محفل آرا

ریاض و عارف و سائل کہیں تھے
حلیم و ناظر و مائل کہیں تھے

کہیں محروم و طالب اور شاعر
کہیں ارباب صوفی و نظم و ساحر

کہیں بیٹھے تھے دلگیر اور حسرت
کہیں مجلس نشیں تھے شاد و وحشت

حفیظ جونپوری تھے کسی جا
عزیز لکھنوی بھی تھے کسی جا

غرض اس طرح لاکھوں اور شاعر
زباں دانی میں فرد اُستاد و ماہر

جماکر محفل ارباب دانا
تھے اس گلزار میں تشریف فرما

کہاں تک ذکر میں اُن کا کرونگا
ثنا خوانی کا ان کی دم بھرونگا

تغزل میں کوئی اُستاد دیکھا
قصائد میں کسی کو شاد دیکھا

کوئی پروانہ تھا شمع سخن کا
لطائف دل لگی میں کوئی یکتا

تصوف کا کسی میں رنگ گہرا
ظرافت کا کسی کے سر پہ سہرا

کوئی الفاظ کا متروک داں تھا
کوئی ترکیب کی جستی کی جاں تھا

کہیں شوکت بیانی ناز پر تھی
کہیں نازک خیالی جلوہ گر تھی

کوئی علامہ و اُستاد فن تھا
کسی کے ہر سخن میں بانکپن تھا

کوئی اُستاد اسلوب قدیمی
کوئی تھا محرم سنگھم نہ لبسی

کسی کے لطف سے سیراب گلشن
کسی سے ریختی کا نام روشن

کوئی تھا سادگی کا بسکہ شائق
قصیدے میں غزل میں کوئی لائق

کوئی اُستاد ادب اور شاعری میں
ممیز باطنی و ظاہری میں

کمال مرثیہ گوئی کہیں تھا
کہیں اسلوب بندش دلنشیں تھا

کہیں برجستگی افسون دلکش
کہیں فکر رسا مضمون دلکش

کہیں جوش و خروش نوحہ خواں تھا
کہیں ناز صنم کا نکتہ داں تھا

کوئی تھا شائق[28] شستہ بیانی — کوئی تھا مالکِ ملکِ معانی
کوئی تھا شاہ شیریں اور خوش رنگ — کیا زندہ کسی[29] نے پھر سخن کو
کسی[31] کا طرزِ رندانہ ستم تھا — کسی[30] کا جام رشکِ جامِ جم تھا
کوئی[33] استادِ مضموں آفرینی — کوئی[32] تھا صاحبِ باریک بینی
کسی کی خوش[34] مقامی قابلِ داد — کسی کا سوز[35] و حسرت لائقِ صاد
کوئی زیبِ[37] جمالی سے تبلا — کوئی داغِ[36] نقائص سے مبرّا
کوئی تھا[38] زود گوئی میں سرافراز — کوئی رنگینیٔ[39] مضموں میں ممتاز
کوئی استاد[40] گلزارِ معانی — کوئی دلدادۂ[41] سحر البیانی
کوئی مغلوبِ[42] جذبِ درد انگیز — کوئی مفتونِ لطفِ حسن خیز
کوئی حاضر[44] جوابی میں تھا طرّار — کوئی نازک[45] نگاری میں تھا ہشیار
کوئی فیضیٔ[46] سیاہی کا ثانی — کسی کے ہاں[47] سلاست اور روانی
کوئی طبّاع[49] محوِ فکرِ عالی — کوئی عرفان[48] و وحدت کا سوالی
کوئی[51] پیچیدہ اسلوبی سے مرعوب — کسی کو پیچ[50] کل استعار مرغوب
تصوف[52] میں کوئی فردِ زمانہ — تغزل[53] میں کوئی فردِ یگانہ
کوئی[54] نازک خیالی کی تھا تعمیر — کسی کی نظم[55] میں ناٹک کی تاثیر
طبیعت[56] تھی کسی کی سحر دخار — بلاغت[57] کا کسی کے سر پہ سنگار
کوئی تیلا[58] مذاقِ مغربی کا — کوئی موجد[59] سخن کی تازگی کا
کسی کی[60] طبع میں حاضر روانی — تھی نیچر[61] کی کسی کی ترجمانی
کسی[62] کا مذہبی تھا رنگِ تحریر — کوئی شستہ[63] مذاقی کی تھا تصویر

قدیمی رنگ تھا غالب کسی پر — کوئی جدت پسندی کا تھا خوگر
کسی میں مشق طرز اہل فن تھی — کسی سے رونق بزم سخن تھی
تخیل میں کوئی نامی گرامی — کوئی طرز قدیم و نو کا بانی
کسی کا مدعا نازک نگاری — صفائی میں کسی کی شہسواری
نئی طرزوں میں کوئی مرد میدان — کوئی برجستہ شوخی کا نگہبان
کوئی وارفتگی رندی سے واقف — کوئی باریکیٔ مضموں کا عارف
کوئی شیریں بیاں نازک ادا سے — کوئی ممتاز تھا فکر رسا سے
کسی کو اشتیاق طرز حالی — کسی میں عشق کے جذبات عالی
کسی میں منظر قدرت کا سامان — نئی رنگت کسی میں تھی نمایاں
کوئی تھا ہمنوائے بلبل ہند — کوئی تھا آشنائے بلبل ہند
کسی میں حسن معنی قابل دید — کوئی شیدائے چمنستان تنقید
کسی میں عارفانہ وجد و حکمت — کسی میں روزمرہ کی لطافت
کہیں سنجیدہ غزلوں کی متانت — کہیں اسباب آرائش ذہانت
کوئی تھا نشۂ وحدت کا مائل — کوئی سوز و گداز دل کا قائل
کوئی رنگ تغزل کا تھا مشتاق — غرض ہر ایک اپنے فن میں تھا طاق
بہت اس بزم کے جب رنگ دیکھے — نئے طرز اور نرالے ڈھنگ دیکھے
تعجب بڑھ گیا حیراں ہوا میں — ز بس ممنون جان جاں ہوا میں
کوئی گلزار دنیا میں نہ ایسا — کبھی دیکھا تھا میں نے یا سنا تھا
میں اس کے حال کا جویا ہوا پھر — اور اپنے یار سے گویا ہوا پھر

ہے مالی کون اس رنگیں چمن کا؟ | وہ محسن سرپرست اہل سخن کا
رئیس نامور لالہ سری رام | کیا ہے زندہ جس نے شعر کا نام
وہی ہے نخل بند اس گلستاں کا | وہی ہے قدرداں رنگیں بیاں کا
عرق ریزی کا اس کی یہ ثمر ہے | اسی سے تازہ اس کا برگ و بر ہے
بہت کچھ خرچ کر کے مال و دولت | اٹھا کر رنج و غم اور بار محنت
بلائے اہل موجودہ و پیشیں | سجائی محفل ارباب رنگیں۔
بنے خود میزبان محفل آرا | ہر اک اہل سخن کو ہے ابھارا
تعجب میرا اس سے بڑھ گیا پھر | یہ سیر باغ ہائے غم ربا پھر
جو دیکھا اس چمن کو ابتدا سے | دعا اب مانگے طالب خدا سے
الٰہی ان کو تو آباد رکھنا | ہمیشہ خرم و دلشاد رکھنا
رہیں وہ مایہ مشہور عالم | قبول اہل دل۔ منظور عالم
معطر ساز یہ باغ سخن ہو | مسرت بخش ان کی انجمن ہو

فہرست اسماء شعراء متذکرہ تقریظ خمخانۂ جاوید

(۱) مرزا محمد رفیع سودا
(۲) میر محمد تقی میر
(۳) سید محمد میر سوز
(۴) شیخ قلندر بخش جرات
(۵) خواجہ میر درد۔
(۶) سید انشاء اللہ خاں انشا
(۷) شیخ ظہور الدین حاتم۔
(۸) میرزا عبدالحی تاباں
(۹) شیخ امام بخش ناسخ
(۱۰) حکیم مومن خاں مومن
(۱۱) سید مظفر علی خاں بہادر اسیر
(۱۲) فتح الدولہ میرزا محمد رضا خاں برق
لکھنوی اور منشی مہاراج برق دہلوی
(دونوں کی طرف اشارہ ہے)
(۱۳) شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی
اور مولانا عبدالراسخ دہلوی)
(دونوں کی طرف اشارہ ہے)
(۱۴) شاہ نصیر دہلوی استاد ذوق
(۱۵) سراج الدین علی خاں آرزو
(۱۶) مرزا سعادت یار خاں رنگین
(۱۷) مرزا رحیم الدین حیا۔
(۱۸) خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق
(۱۹) نجم الدولہ دبیر الملک مرزا
اسد اللہ خاں غالب۔
(۲۰) میر ببر علی انیس۔
(۲۱) خواجہ حیدر علی آتش۔
(۲۲) حافظ عبدالرحمن خاں احسان
(۲۳) سید شجاع الدین عرف امراؤ
مرزا انور۔
(۲۴) مرزا سلامت علی دبیر۔
(۲۵) مرزا قادر بخش صابر۔
(۲۶) منشی بہاری لال مشتاق

(۲۷) لالہ مادھو رام جوہر
(۲۸) شیخ ولی محمد نظیر۔
(۲۹) نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ
(۳۰) نواب سید محمد خاں رند
(۳۱) پنڈت جواہر ناتھ کول ساقی۔
(۳۲) سید محمد ذکریا خاں ذکی
(۳۳) میر مہدی حسین مجروح۔
(۳۴) مولانا سید ظہیر الدین ظہیر
(۳۵) مولوی ذاکر حسین یاس
(۳۶) مرزا عبدالغنی ارشد۔
(۳۷) خواجہ وزیر علی وزیر
(۳۸) میر علی اوسط رشک۔
(۳۹) آنریبل نواب محمد خاں رنگی
(۴۰) پنڈت دیا شنکر نسیم۔
(۴۱) میر غلام حسن حسن۔
(۴۲) مرزا قربان علی بیگ سالک
(۴۳) میر وزیر علی صبا۔
(۴۴) مولوی سیف الحق ادیب۔
(۴۵) سید مہدی حسن۔ احسن۔

(۴۶) مولانا سید احمد حسن شوکت
(۴۷) منشی رام سہائے تمنا۔
(۴۸) مولانا فخر الدین نسیم دہلوی
(۴۹) نواب الٰہی بخش خاں معروف
(۵۰) مولانا محمد حسین آزاد
(۵۱) خواجہ الطاف حسین حالی۔
(۵۲) منشی امیر احمد امیر مینائی
(۵۳) فصیح الملک نواب مرزا خاں
داغ دہلوی۔
(۵۴) پنڈت بشن نرائن در ابر
(۵۵) منشی احمد علی شوق قدوائی
(۵۶) پنڈت رتن ناتھ در سرشار
(۵۷) منشی امیر اللہ تسلیم۔
(۵۸) سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی۔
(۵۹) حکیم سید ضامن علی جلال۔
(۶۰) مولانا نجم الدین احمد ثاقب
(۶۱) منشی پیارے لال شاکر۔
(۶۲) لسان الشعرا منشی دوارکا پرشاد
صاحب افق

(۶۳) منشی سید محمد نوح نوح

(۶۴) منشی نوبت رائے نظر

(۶۵) منشی درگا سہائے سرور

(۶۶) بابو پیارے لال رونق

(۶۷) ناظم دہلوی ثم لاہوری۔

(۶۸) سر ڈاکٹر محمد اقبال اقبال

(۶۹) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

(۷۰) آغا محمد شاہ حشر

(۷۱) بابو رام رچھپال سنگھ شیدا
اور منشی جیندی پرشاد شیدا۔
(دونوں سے مطلب ہے)

(۷۲) پنڈت برج نرائن چکبست

(۷۳) منشی سید وحید الدین بیخود

(۷۴) منشی سید ریاض احمد ریاض

(۷۵) مرزا زین العابدین خاں عارف

(۷۶) نواب سراج الدین احمد
خاں سائل۔

(۷۷) حافظ جلیل حسن جلیل۔

(۷۸) چودھری خوشی محمد ناظر

(۷۹) مرزا محمد تقی بیگ مائل اور
جنیشور پرشاد مائل
(دونوں سے مطلب ہے)

(۸۰) منشی تلوک چند محروم۔

(۸۱) منشی دوارکا پرشاد طالب
بنارسی اور راقم تقریظ۔
(دونوں سے مطلب ہے)

(۸۲) افسر الشعراء آغا شاعر
قزلباش شاعر۔

(۸۳) پنڈت راج نرائن ارمان

(۸۴) مولانا صفی لکھنوی۔

(۸۵) حیدر یار جنگ سید علی حیدر
طباطبائی نظم۔

(۸۶) پنڈت امرناتھ مدن ساحر

(۸۷) شاہ سید نظام الدین دلگیر

(۸۸) مولانا فضل الحسن حسرت موہانی

(۸۹) ہز اکسی لینسی مہاراجہ سر کشن پرشاد
شاد اور شاد عظیم آبادی۔
(دونوں سے مطلب ہے)

(۹۰) مولانا رضا علی وحشت۔

(۹۱) حافظ محمد علی حفیظ

(۹۲) مرزا محمد ہادی عزیز۔

نوٹ (۱) جہاں دو شاعروں کے طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ صنف شعر میں دونوں کا لحاظ رکھا گیا ہے

(۲) حتی الوسع ہمعصر شعراء کا ذکر ساتھ کیا گیا ہے۔

(طالب)



گرامی نامۂ جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے

صدر مہتمم تعلیمات و سکرٹری انجمن " ترقی اُردو " اورنگ آباد دکن

اورنگ آباد دکن
یکم نومبر سنہ ۱۹۲۵ء

کرم فرمائے بندہ زاد لطفہٗ

تسلیم آپ کا عنایت نامہ پہنچا اور اس سے قبل آپ کا مجموعۂ کلام پہنچا اس حسن یادآوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر اس کے دوسرے ہی روز مجھے سفر جانا پڑا اور ایک مدت تک باہر رہنا پڑا۔ اس وجہ سے نہ تو میں آپکے کلام کا لطف حاصل کر سکا اور نہ جواب لکھ سکا جس کی معافی چاہتا ہوں۔ مجھے اس امر کا افسوس ہے کہ پچھلی گرمیوں میں جب میں سری نگر میں تھا تو آپ سے ملنے کا موقعہ نہ ملا اور نہ کسی نے میری رہنمائی کی۔ حضرت کیفی کی ملاقات کا مجھے بیحد شوق تھا۔ مگر اس سے بھی محروم رہا۔ کیونکہ وہاں تشریف نہ رکھتے تھے[1]
میں نے جستہ جستہ آپ کا کلام دیکھا۔ مجھے فی الحقیقت تعجب ہے کہ آپ نے وادیٔ کشمیر میں رہ کر اُردو زبان پر ایسی قدرت کیوں کر حاصل کر لی یہ آپ کی ذہانت اور فراست کی دلیل ہے اس پر آپ کی نظر آپ کا بیان قابل

[1] تا رمضان دنوں بمقام لاہور امتحان ایم۔ اے کی تیاری میں معروف تھا۔ طالب

دہی بیان میں صفائی اور گدازی اور یہ بڑی تعریف کی بات ہی

حضرت کیفی نے ایسا اچھا دیباچہ آپ کے کلام پہ لکھا ہی کہ اس کے ہوتے مجھے قلم اُٹھاتے ہوئے حجاب معلوم ہوتا ہی۔ مجھے اس میں شک نہیں آپ کا کلام پڑھکر مسترت ہوئی اور میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

اگر حضرت کیفی وہاں تشریف رکھتے ہوں تو میری طرف سے ان کی خدمت بابرکت میں سلام نیاز پہنچا دیجیگا۔

نیاز مند

عبدالحق

رشحات التخیل پر نظامی بدایونی کی مختصر رائے

حضرت طالب کاشمیری ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو چار چاند لگانے میں بہت کچھ سعی کی ہے۔ اگرچہ ان کا کلام متفرق طور پر اس سے پہلے پرچوں میں آچکا ہے۔ لیکن مکمل صورت میں یہ مجموعہ ان کا پہلا دیوان ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہو کر ناظرین کے ہاتھ میں پہنچا ہے طالب صاحب کی مشق سخن تقریباً پندرہ سال کی ہے۔ آپ کے کلام کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادراک تصور سے جو مضامین آپ کے ذہن میں آتے ہیں آپ پورے طور پر بہترین الفاظ میں اس کی تصویر کھینچنے پر قادر ہیں شعر کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ سننے والے پر اپنا اثر ڈالے اس کلام میں یہ خاص صفت بدرجۂ اولیٰ موجود ہے زبان کے لحاظ سے طالب کا کلام صاف اور ستھرا ہے تکلف کا نام نہیں تراکیب اور مطالب بھی خوب ہیں اگرچہ اس کلام میں بہت کچھ ترقی کی گنجائش بھی نظر آتی ہے لیکن اس کے موجودہ تیور زبان حال سے بتا رہے ہیں کہ کچھ دنوں کی مشق کے بعد طالب کشمیری ہماری زبان کے ایک مستند شاعر مانے جائیں گے خدا سے دعا ہے کہ یہ کلام جو نظامی پریس بدایوں سے پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے مقبول خاص و عام ہو اور اردو ادب کے افق پر ستارہ بن کر چمکے۔

خاکسار نظامی بدایونی

۸ اگست ۱۹۲۵ء

اردو نظم میں نظامی پریس کی خاص مطبوعات

مراثی انیس جلد اول و دوم — مرتبہ علی حیدر صاحب طباطبائی ۔ نئی ترتیب دلچسپ مقدمہ عجیب چھپائی ۔ میر صاحب کا فوٹو بھی شامل ہے ۔ جلد اول مجلد [illegible] حصہ دوم غیر مجلد [illegible] مجلد [illegible] ۔

دیوان غالب اردو مشرح پاکٹ ایڈیشن — عمدہ چھپائی چکنا کاغذ مولانا نظامی بدایونی کے مقبول عام شرح کے ساتھ جو بطور فٹ نوٹ شامل ہے مع فوٹو غالب قیمت مجلد [illegible]

دیوان غالب لائبریری ایڈیشن — جلی قلم ۔ ملا شرح ۔ غالب مرحوم کا مستند فوٹو اور خود نوشتہ سوانح عمری ۔ خاتمہ پر مشکل الفاظ اور محاورات کی فرہنگ ۔ قیمت غیر مجلد [illegible] مجلد [illegible] ۔

دیوان خواجہ میر درد — ایک مستند اور قدیم قلمی نسخہ سے نقل کیا گیا ہے ۔ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر کا مقدمہ شامل ہے قیمت غیر مجلد [illegible] مجلد [illegible] ۔

انتخاب زریں — تقریباً سو شعرائے ماضی و حال کا مختصر حال مع نمونہ کلام مرتبہ سید راس مسعود صاحب ۔ چھپائی عمدہ جلد خوب صورت قیمت [illegible]

قصائد ذوق — استاد ذوق مرحوم کے قصائد قطعات ۔ رباعیات کو یکجا کر کے طبع کرایا گیا ہے ۔ طباعت ۔ کاغذ ۔ لکھائی ۔ نفیس ۔ مرتبہ آنریبل جسٹس ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان صاحب جج ہائی کورٹ الہ آباد قیمت [illegible] ۔

ملنے کا پتہ ۔ منیجر نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں یو پی ۔